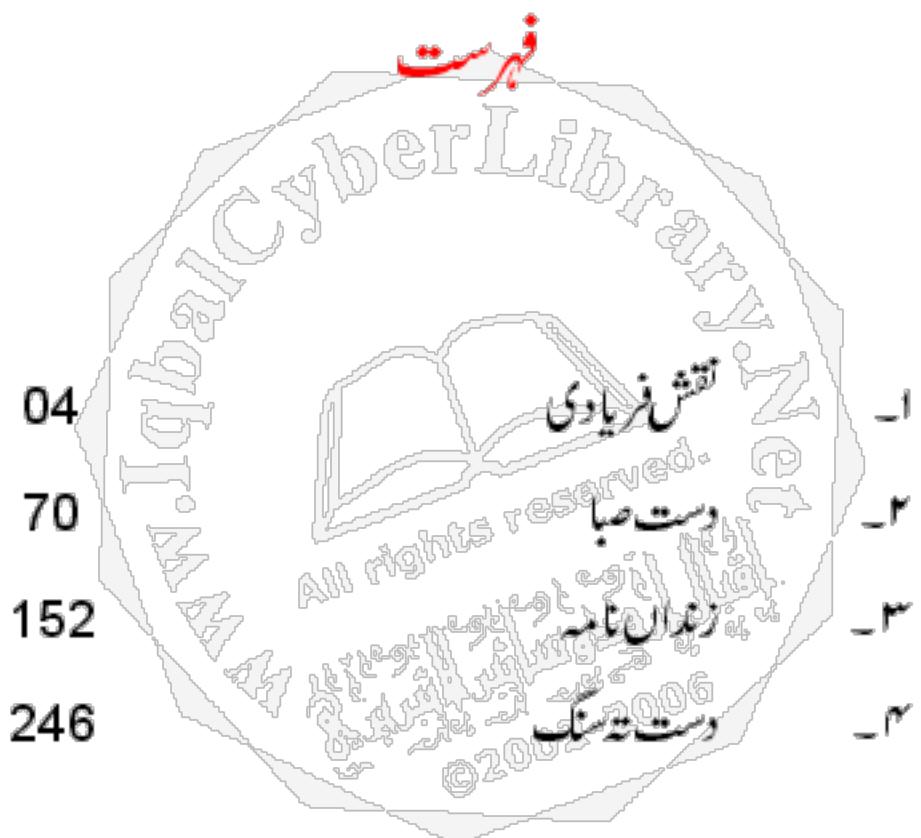




فیض احمد فیض









## اشعار

رات یوں دل میں تری کھولی ہوئی بیوی آئی  
جیسے ویرانہ میں پکپکے ہے بہار آئے  
جیسے محروم میں ہوئے ہے چلے بادشاہیم  
جیسے بیکار کو بے وجہ قرار آجائے

دل رہیں غم جہاں ہے آج  
ہر نفس تشنہ فغاں ہے آج  
سخت ویراں ہے محفل ہستی  
اے غم دوست! تو کہاں ہے آج



## خدا وہ وقت نہ لائے ----

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو  
سکون کی نید بچتے بھی حرام ہو جائے  
تری مسرت All rights reserved. تمام ہو جائے  
تری حیات بچتے بچتے تلخ جام ہو جائے  
عقول سے آئینہ دل گداز ہو تیرا  
جہوم یاس سے بے ناب ہو کے رہ جائے  
وفور درد سے سیماں ہو کے رہ جائے  
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے  
غور حسن سرپا نیاز ہو تیرا  
طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے  
تری نگاہ کسی غم گسار کو ترسے  
خزان رسیدہ تمنا بہار کو ترسے  
کوئی جبیں نہ ترسے منگ آستاں پہ بھکے  
کہ جنس عجز و عقیدت سے تجوہ کو شاد کرے  
فریب وعدہ فردا پہ اعتماد کرے  
خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجوہ کو یاد آئے  
وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے  
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

Cyber Library

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو

سکون کی نید بچتے بھی حرام ہو جائے

تری مسرت تمام ہو جائے

تری بچتے بچتے تلخ جام ہو جائے

عقول سے آئینہ دل گداز ہو تیرا

جہوم یاس سے بے ناب ہو کے رہ جائے

وفور درد سے سیماں ہو کے رہ جائے

ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے

غور حسن سرپا نیاز ہو تیرا

طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے

تری نگاہ کسی غم گسار کو ترسے

خزان رسیدہ تمنا بہار کو ترسے

کوئی جبیں نہ ترسے منگ آستاں پہ بھکے

کہ جنس عجز و عقیدت سے تجوہ کو شاد کرے

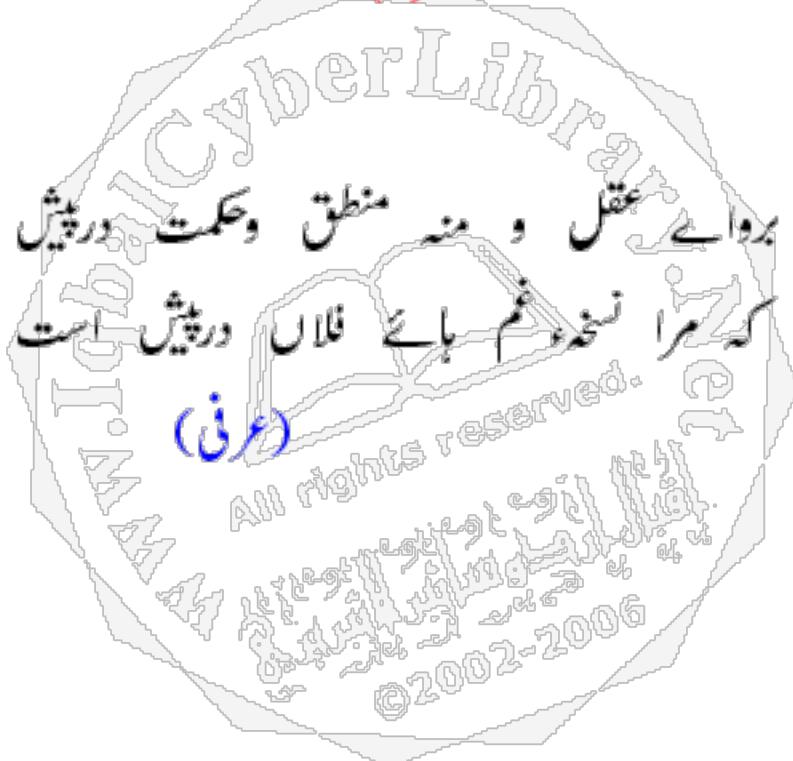
فریب وعدہ فردا پہ اعتماد کرے

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجوہ کو یاد آئے

وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے

وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

(٤)





سوڑش درد دل کے معلوم!  
کون جانے کسی کے عشق کا راز

میری خاموشیوں میں لرزائ ہے  
میرے نالوں کی گم شدہ آواز

ہو چکا عشق، اب ہوش ہی کہی  
کیا کریں فرض ہے اداۓ نماز

تو ہے اور ایک تغافل پیام  
میں ہوں اور انتظار بے انداز

فیض ناکامی امید ہے خوف

ورنہ دل توڑ دے مجاز طسم



All rights reserved.

الحقوق محفوظة  
© 2002-2006

© 2002-2006

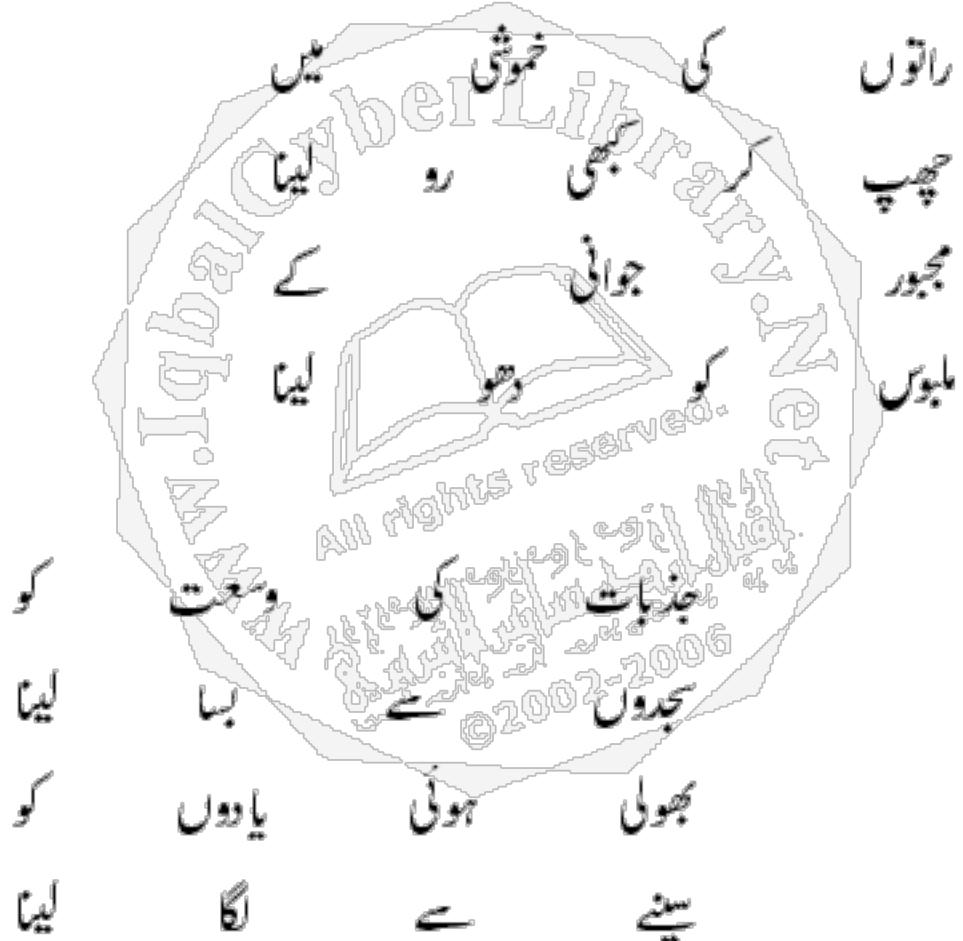
## انہتائے کار



پندار  
ناکام  
آغاز  
انجام

ریگیڈیونی  
دنیا سا ہو مایوس جانا  
کر دکھتا ہوا دل لے تنهائی میں کھو جانا

ترسی ہوئی نظرؤں کو حسرت  
لینا سے جھکا کو فریاد  
لینا میں چھپا آہوں



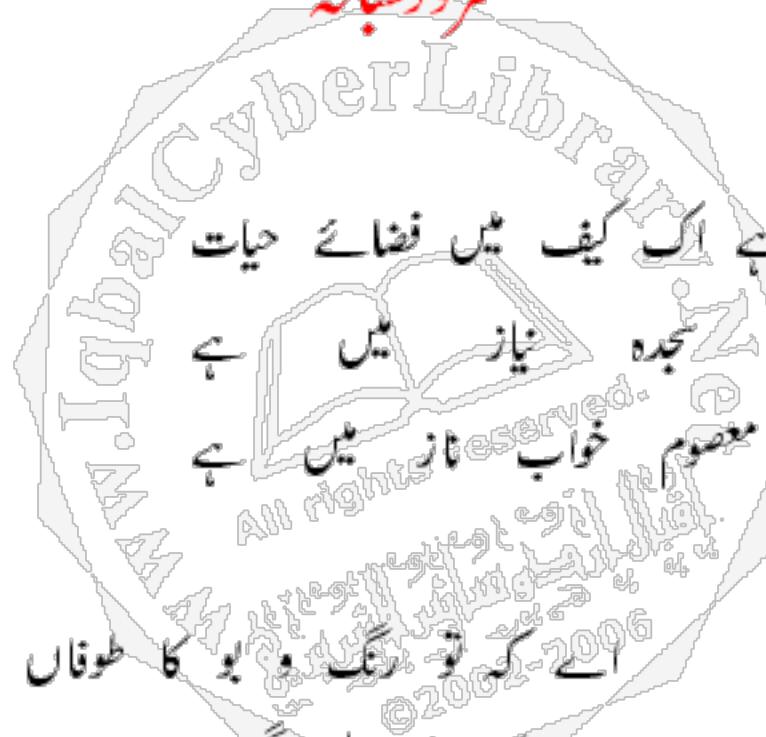
♦♦♦

انجام

بیں لبریریز آہوں سے ٹھنڈی ہواں میں  
اداکی میں ڈوبی ہوئی ہیں ٹھائیں  
محبت کی دنیا پر شام اچکی ہے  
سیہر پیش ہیں زندگی کی نشانیں  
محلق ہیں 2006ء میں لاکھ آرزوں میں  
ڑپتی ہیں آنکھوں میں لاکھ التجائیں  
تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں  
تمہارے ستم اور میری وفا میں  
مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل  
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں



سرودشانہ



گم ہے اک کیف میں فضائے حیات  
خامشی سجدہ نیاز میں ہے  
حسن معصوم خواب ناز میں ہے  
اے کہ تو رنگِ بُو کا طوفان ہے  
اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے  
زندگی تیرے اختیار میں ہے

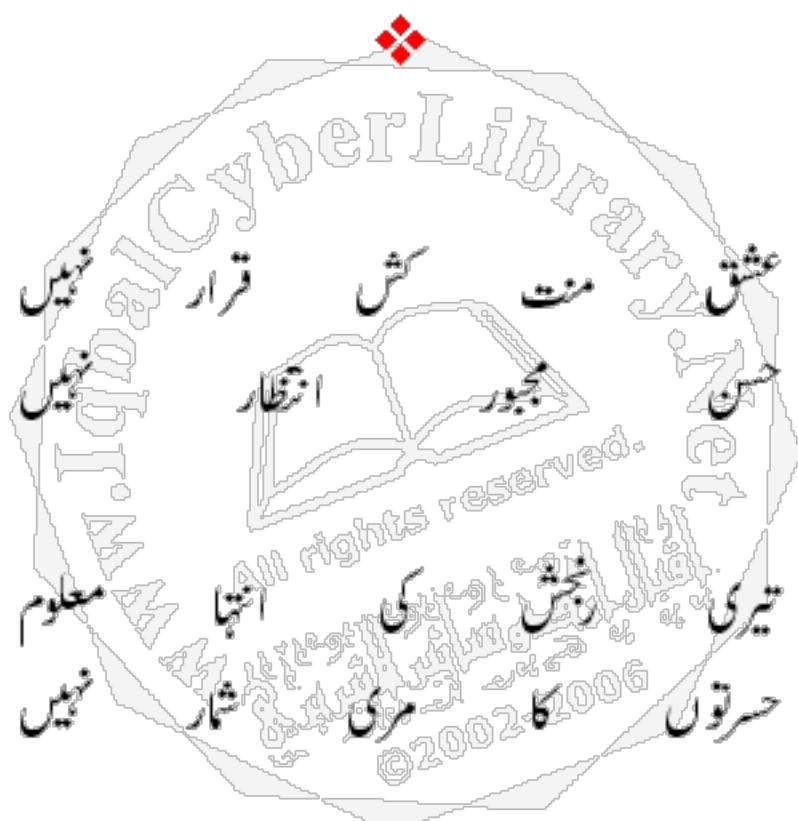
پھول لاکھوں برس نہیں رہتے  
دو گھری اور ہے بہار شباب  
ا کہ کچھ دل کی سن سنا لیں ہم  
ا محبت کے گیت گا لیں ہم

میری تھائیوں پہ شام رہے؟  
حضرت دید نا تمام رہے؟  
دل میں بے تاب ہے صدائے حیات  
آنکھ گوہر شار کرتی ہے



اوائے حسن کی مخصوصیت کو کم کر دے  
گناہ گار نظر کو حباب آتا ہے





اپنی نظریں سمجھیر دے ساقی  
مے پہ اندازہ خمار نہیں

زیر لب ہے ابھی تبسم دوست  
منتشر جلوہ بہار نہیں

اپنی حکمیل کر رہا ہوں میں  
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار کو نہیں

چارہ انتظار کون کرے  
تیری نفرت بھی استوار نہیں

فیض زندہ رہیں وہ ہیں تو کسی  
کیا ہوا گر وفا شعار نہیں

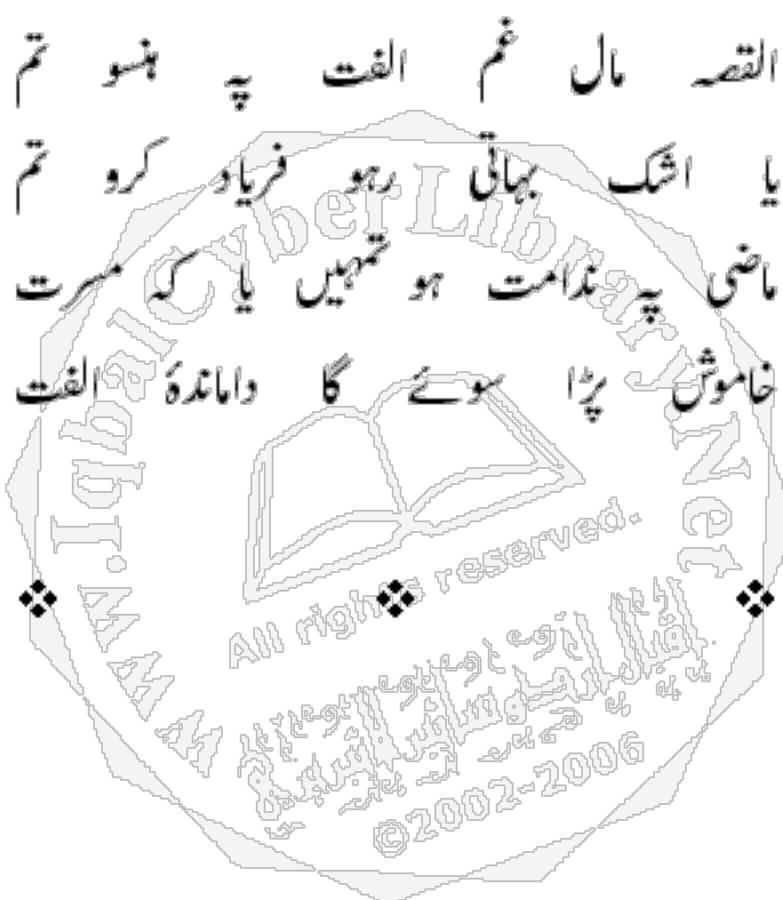


## آخری خط

وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے  
جب درد سے لک جائیں گی سب زیست کی راہیں  
اور حد سے گزر جانے کا اندوہ نہایت  
تھک جائیں گی متھی ہوئی ناکام نکالیں  
چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو مری آہیں  
چھن جائے گی مجھ سے مری بے کار جوانی

شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی  
اپنے دل معصوم کو ناشاد کرو گی  
اوہ گی مری گور پہ تم اشک بہانے  
نو خیز بھاروں کے حصیں پھول چڑھانے

شاید مری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی  
شاید مری بے سود وفاوں پہ نہو گی  
اس وضع کرم کا بھی تمہیں پاس نہ ہو گا  
لیکن دل ناکام کو احساس نہ ہو گا





عشق دل میں رہے تو رسوا ہو  
لب پہ آئے تو راز ہو جائے  
طف کا انتظار کرتا ہوں  
جور تاحد ناز ہو جائے  
عمر بے سود کٹ رہی ہے فیض  
کاش افشاء راز ہو جائے



حسینہ خیال سے!

Cyber Library  
بھروسے دے

ریلے ہوٹ، مخصوصاً پیشانی، حسینہ خیال سے!  
کہ میں اک بار پھر زنگیوں میں غرق ہو جاؤں!  
امری بستق کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے  
ہمیشہ کے لیے اس وام میں محفوظ ہو جاؤں  
ضیائے حسن سے کلمات دنیا میں نہ پھر آؤں  
گزشتہ حرتوں کے داغ میرے دل سے دھل جائیں  
میں آنے والے غم کی فکر سے آزاد ہو جاؤں  
مرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں  
مجھے وہ اک نظر، اک جاوہانی سی نظر دے دے

(برونگ)



# مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو  
ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل رونش ہے  
تر سے جلوؤں سے جرم زندگی جنت بدامن ہے  
مری رونج اب بھی ہٹھائی میں تجوہ کو یاد کرتی ہے  
ہر اک تار قفس میں آڑزو بیمار ہے اب بھی  
ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی  
نظاہیں بچھے رہی ہیں راستہ زرکار ہے اب بھی  
مگر جان حزیں صدمے سہے گی آخرش کب تک؟  
تری بے مہربوں پر جان دے گی آخرش کب تک؟  
تری آواز میں سوئی ہوئی شیرینیاں آخر  
مرے دل کی فردہ خلوتوں میں جانہ پائیں گی  
یہ اشکوں کی فراوانی سے دھنڈ لائی ہوئی آنکھیں  
تری رعنائیوں کی تملکت کو بھول جائیں گی  
پکاریں گے تجھے تو لمب کوئی لذت نہ پائیں گے  
گلو میں تیری الفت کے ترانے سوکھ جائیں گے  
مبادا یاد ہائے عہد ماضی محو ہو جائیں  
یہ پارینہ فسانے موج ہائے غم میں کھو جائیں  
مرے دل کی تھوں سے تیری صورت دھل کے بے جائے

حریمِ عشق کی شمع درخشاں بجھ کے رہ جائے  
مباوا اجنبی دنیا کی ظلمت گھیر لے تجھ کو!  
مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو



بعد از وقت

Cyber Library

دل کو احسان سے دو چار نہ کر دینا تھا  
ساز خوابیدہ کو بیدار نہ کر دینا تھا  
اپنے معصوم تبیم کی فروانی کو  
شوک مجبور کو بس ایک جھلک دکھلنا کر دینا تھا  
واقف لذت تکرار نہ کر دینا تھا

All rights reserved.  
Digitized by srujanika@gmail.com  
Original work © 2006

چشم مشاق کی خاموش تمناؤں  
یک بیک مائل گفتار نہ کر دینا تھا  
جلوہ حسن کو مستور ہی رہنے دیتے  
حضرت دل کو گنہگار نہ کر دینا تھا



سرور شبانہ

نیم شب، چاند، خود فراموشی  
محفل پکیڑ خاموشی  
بود ویراں ہے جست انتقام  
ایضاً ہے بود انتقام  
سماں نجم و فتوحہ  
آنکھوں میں سکوت جاری ہے  
آبشار 2006  
© 2006  
چار سو بے خودی کی طاری ہے  
زندگی جزو خواب ہے گویا  
ساری دنیا سراب ہے گویا  
سو رہی ہے گھنے درختوں پر  
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز  
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے  
کہہ رہی ہے حدیث شوق نیاز  
ساز دل کے خوش تاروں سے  
چھن رہا ہے خمار کیف آگیں  
آرزو، خواب، تیرا روئے حسین



## اشعار

وہ عہدِ غم کی کاہشائے بے حاصل کو کیا سمجھے  
جو ان کی مختصر رواداں بھی صبر آزمائے سمجھے  
یہاں واپسی، واں برہمی، کیا جائے کیوں ہے؟  
نہ ہم اپنی نظر سمجھے نہ ہم ان کی ادا سمجھے  
فریب آرزو کی میل انگاری نہیں جاتی  
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

تمہاری ہر نظر سے مسلک ہے رشتہ مستی  
مگر یہ دور کی باتیں کوئی نادان کیا سمجھے  
نہ پوچھو عہدِ الفت کی، بس اک خواب پریشان تھا  
نہ دل کو راہ پر لائے نہ دل کا مدعا سمجھے



## قطعات



فضائے دل پر اداں بکھرتی جاتی ہے  
فردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے  
فریب زیست سے قدرت کا مدعا معلوم  
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے



گزر رہے میں شب و روز تم نہیں آتیں  
 ریاض زیست ہے آزرمہ بہار ابھی  
 مرے خیال کی دنیا ہے سو گوارا ابھی  
 جو حسرتیں تے غم کی کفیل ہیں پیاری  
 ابھی تک مری تھائیوں میں اپتنی ہیں  
 طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری

ادس آنکھیں تری دید کو ترسی ہیں  
 بہار حسن پ پاہندی جفا کب تک؟  
 یہ آزمائش صبر گرین پا کب تک؟  
 قسم تھماری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں  
 غلط تھا دعویٰ صبر و شلیب، آ جاؤ  
 قرار خاطر بیتاب، تھک گیا ہوں میں



نہ نجوم

نہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں  
نجوم شوق سے اک دل ہے بے قرار ابھی  
خمار خواب سے لبریت اصریں آنکھیں  
چھلک رہی ہے جوانی ۱۹۰۶ء اک رونم موسمے  
رواں ہو گل گل ترے چیسے سیل شیم  
ضیائے دمہ میں دملتا ہے رنگ پیراہن  
ادائے عجز سے آنچل اڑا رہی ہے نیم  
دراز قد کی ٹپک سے گداز پیدا ہے  
ادائے ناز سے رنگ نیاز پیدا ہے  
اداس آنکھوں میں خاموش التجاہیں ہیں  
دل حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں  
نہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں  
کسی کا حسن ہے مصروف انتظار ابھی  
کہیں خیال کے آباد کردہ گلشن میں  
ہے ایک گل کہ ہے ناواقف بہار ابھی



## حسن اور موت

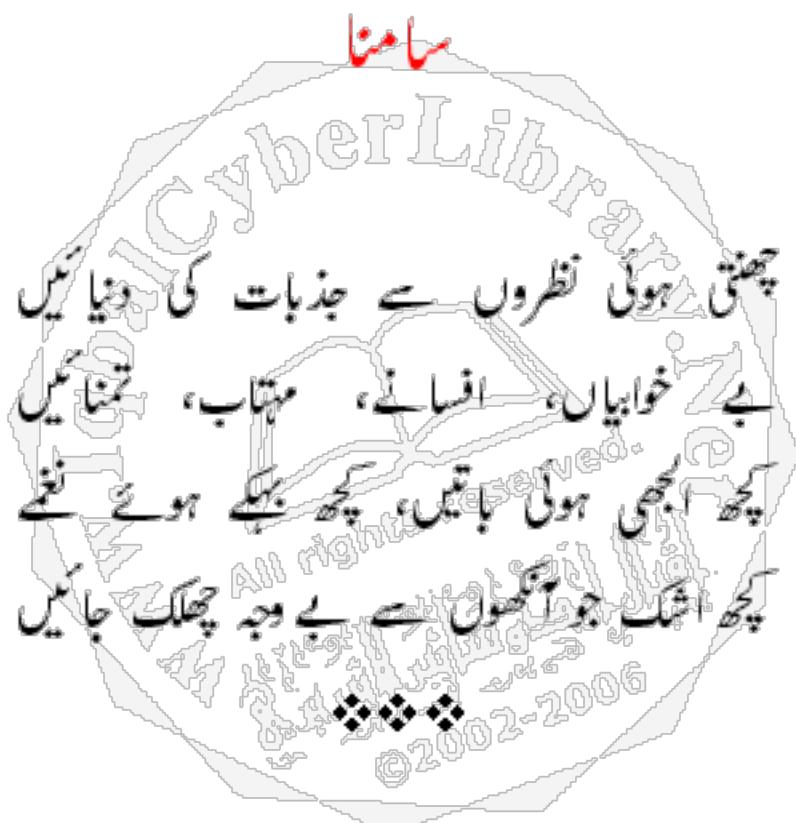
جو پھول سارے گلستان میں سب سے اچھا ہو  
فروغ نور ہو جس سے فضائے نہیں میں  
خزان کے جو روستم گونجس نے دیکھا ہو  
وہ ایک پھول سما تھے چشم گلچیں میں

ہزار پھولوں سے آباد باغ ہستی ہے  
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترسی ہے  
کئی دلوں کی امیدوں کا جو سہارا ہو  
فضائے دہر کی آلودگی سے بالا ہو  
جہاں میں آ کے ابھی جس نے کچھ نہ دیکھا ہو  
نہ تھل عیش و مرت، نہ غم کی ارزانی  
کنار رحمت حق میں اسے سلاتی ہے  
سکوت شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی  
طواف کرنے کو صبح بہار آتی ہے  
صبا چڑھانے کو جنت کے پھول لاتی ہے





شو خیالِ ماض نگاہِ دیدہ سرشار میں  
عشر تینِ خوابیدہ رنگِ غازہ رخسار میں  
سرخ ہفتوں پر قبم کی ضیائیں جس طرح  
یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں ہے گنار میں



## رخصت

فرده رخ، لبوں پر اک نیاز آمیز خاموشی  
تمیم مضھل تھا، مرمرین ہاتھوں میں لرزش تھی  
وہ کیسی بے کسی تھی تیری پر تمکھیں نگاہوں میں  
وہ کیا دکھ تھا تری کہی ہوئی خاموش آہوں میں





عرصہ دہر کے ہنگامے تھے خواب کسی  
گرم رکھ آتش پیکار سے سینہ اپنا

ساقیا رنج نہ کر جاگ اٹھے گی محفل  
اور کچھ دیر اٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا

بیش قیمت ہیں یہ غم ہائے محبت، مت بھول  
ظلمت یاس کو مت سونپ خزینہ اپنا



بیاس

بربط پول کے تاریخ ثوث گئے  
بین زمین بوس راحتیں کے محل  
مفت گئے قصہ مانے فخر و عمل  
نام بخت کے بارجام پھوٹ گئے  
چون گلابی کیف کوثر و تنیم

رخت گریہ و بکا بے سود  
شکوہ بخت نارسا بے سود  
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول  
بند ہے مدتوں سے باب قبول  
بے نیاز دعا ہے رب کریم  
بجھ گئی مشع ارزوئے جمیل  
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل  
انتظار فضول رہنے دے  
راز الفت نباہنے والے  
بار غم سے کراہنے والے  
کاوش بے حصول رہنے دے



## آج کی رات

آج کی رات ساز درد نہ چھیر  
دکھ سے بھر پور دن تمام ہوئے  
اور کل کی خبر کے معلوم؟  
دوش و فردا کی مت چکن ہیں حدود  
ہو نہ ہو اب تھیز کے معلوم؟

زندگی بیج! لیکن آج کی رات  
اپنی دمکت ہے ممکن آج کی رات  
آج کی رات ساز درد نہ چھیر  
اب نہ دہرا فسانہ ہائے الہ  
اپنی قسم پ سوگوار نہ ہو  
فکر فردا اتار دے دل سے  
عمر رفتہ پ اشکبار نہ ہو  
عہد غم کی حکایتیں مت پوچھ  
ہو چکیں سب شکایتیں، مت پوچھ  
آج کی رات ساز درد نہ چھیر





اپنی مشق ستم سے ہاتھ نہ کھینچ  
میں نہیں یا وفا نہیں باقی

تیری چشم الہ نواز کی خیر  
دل میں کوئی گل نہیں باقی

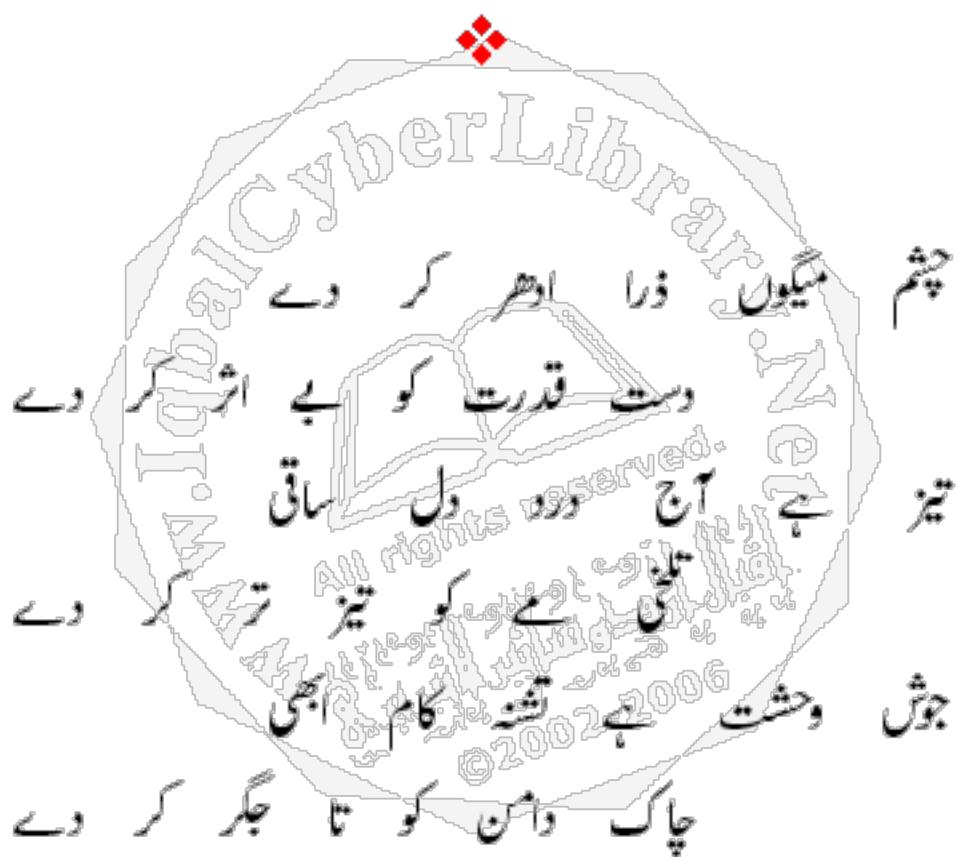
ہو چکا ختم عہد بھر و وصال  
زندگی میں مزا نہیں باقی



ایک ریگزر پر

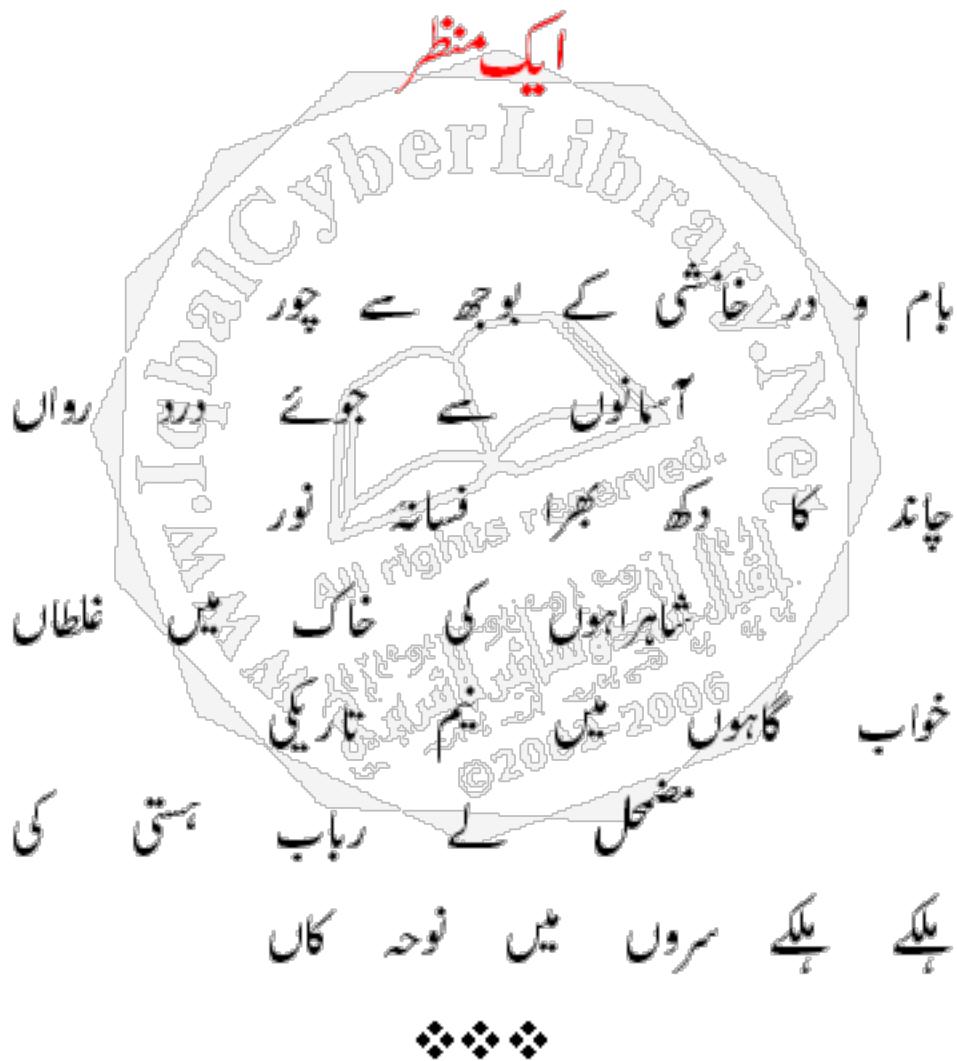
وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرتیں پہاں  
وہ جس کی تمنا میں جنتیں پہاں  
ہزار فتنے تے پائے حاذم خاک نشیں  
بھرا کنگار خمار شباب سے رہیں  
شاب، جس سے تخلیں بچالیاں بڑتیں  
وقار، جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں  
ادائے لغوش پا پر قیامتیں قرباں  
بیاض رخ پر سحر کی صاحبیں قرباں  
سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکھتوں کا ہجوم  
طویل راستوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم  
وہ آنکھ جس کے بناؤ پر خالق اترائے  
زبان شعر کو تعریف کرتے شرم آئے  
وہ ہونٹ، فیض سے جن کے بھار لالہ فروش  
بہشت و کوثر و تسیم و سلسلیں بدوش  
گداو جسم، قبا جس پر سج کے ناز کرے  
دراز قد جسے سرو سہی نماز کرے  
غرض وہ حسن جو محتاج وصف و نام نہیں  
وہ حسن جس کا تصور بشر کا کام نہیں

کسی زمانے میں اس رگزور سے گزرा تھا  
بصد غرور و تجمل، ادھر سے گزرा تھا  
اور اب یہ راہگزور بھی ہے دافریب و حسین  
ہے اس کی خاک میں کیف شراب و شعر مکیں  
ہوا میں مشوختی رفتار کی ادائیں ہیں  
فضا میں نرمی گفتار کی صدائیں ہیں  
غرض وہ حسن اب اس رہ کا جزو منظر ہے  
نیاز بخش کو اک سجدہ گہ بیسرا ہے

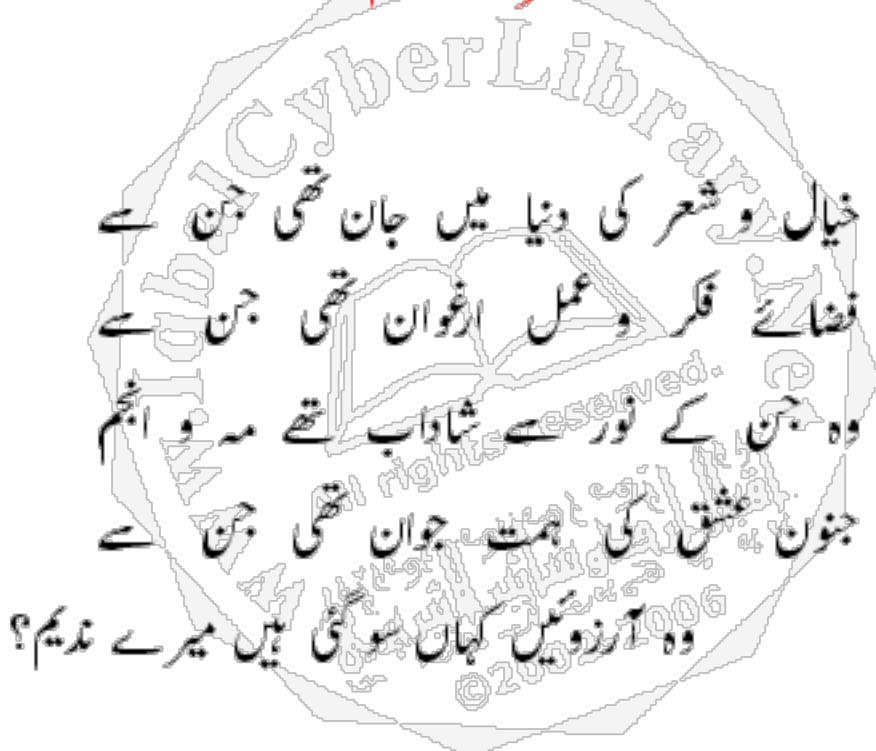


چشم  
 تیر  
 جوش وحشت ہے تشریف کام ابھی  
 چاک دامن کو تا جگر کر دے  
 میری قسم سے کھینے والے  
 مجھ کو قسم سے بے خبر کر دے  
 لٹ رہی ہے مری متاع نیاز  
 کاش وہ اس طرف نظر کر دے  
 فیضِ محیل آرزو معلوم!  
 ہو سکے تو یونہی بمر کر دے





❖❖❖



خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن کے  
فکر و عمل ازگوان تھی جن کے  
وہ جن کے نور کے شواب تھے مہ و ابجم  
جنون و عشق کی بہت جوان تھی جن کے  
وہ آرزوں میں کہاں کھو گئی ہیں میرے ندیم؟

وہ ناصبور لگا ہیں، وہ منتظر را ہیں  
وہ پاس ضبط سے دل میں دلی ہوئی آہیں  
وہ انتظار کی راتیں، طویل تیرہ و تار  
وہ نیم خواب شبستان، وہ محملیں بانجیں  
کہانیاں تھیں، کہیں کھو گئی ہیں، میرے ندیم!

(۱)



# مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

Cyber Library

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات

تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے

تیری صورت سے ہے حالم میں بہاروں کو ثبات

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے۔

تو جو مل جائے تو تقدیریں گنوں میں ہو جائے

یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیانہ ٹلسماں

ریشم و ٹلس و کتاب میں بنوائے ہوئے

جا بجا لکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم

خاک میں لختڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجھے

اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجھے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ



اک فرصت گناہ ملی، وہ بھی چار دن  
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پورڈگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا  
تجھ سے بھی لفربیب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیض  
مت پوچھ ولوں دل ناکردا کار کے





میرا دل غمگین ہے تو کیا  
غمگین یہ دنیا ہے ساری  
یہ دکھ تیرا ہے نہ میرا  
ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

تو گر میری بھی ہو جائے  
دنیا کے غم یونہی رہیں گے  
پاپ کے پھندے، ظلم کے بندھن  
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

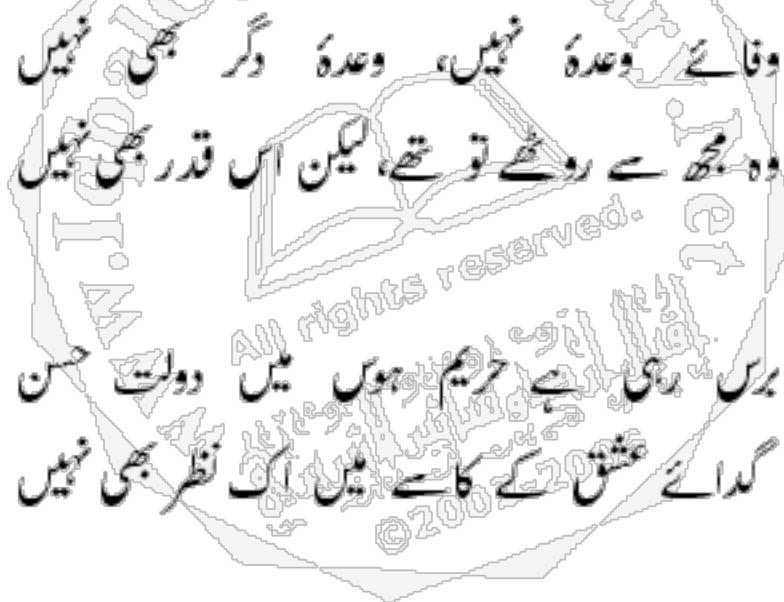
غم ہر حالت میں مہلک ہے  
اپنا ہو یا اور کسی کا  
رونا دھونا، جی کو جلانا

یوں بھی ہمارا، یوں بھی ہمارا

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں  
بعد میں سب تدبیریں سوچیں  
بعد میں سکھ کے سپنے  
کی تدبیریں سپنوں  
بے فکرے دن دن دولت والے  
یہ آخر یوں 2007 خوش رہتے ہیں  
ان کا سکھ آپس میں باشیں  
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

ہم نے ماں جنگ کڑی ہے  
سر پھوٹیں گے، خون بھے گا  
خون میں غم بھی بہ جائیں گے  
ہم نہ رہیں، غم بھی نہ رہے گا

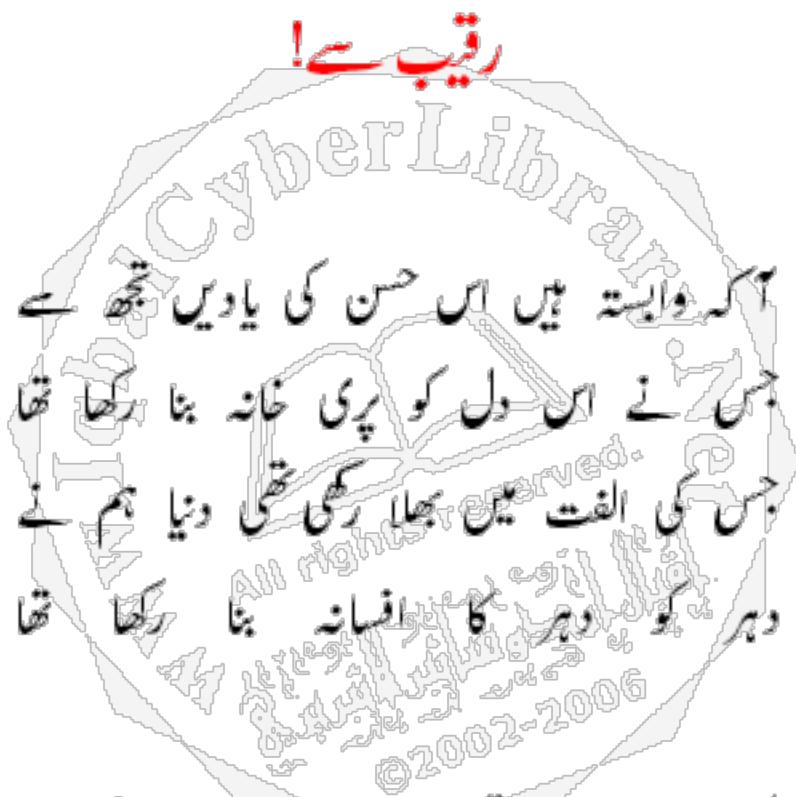




نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں  
اک ایسی راہ پر جو تیری ریگور بھی نہیں

نگاہ شوق سر بلام بے حجاب نہ ہو  
وہ بے خبر ہی کہی، اتنے بے خبر بھی نہیں

یہ عہد ترک محبت ہے، کس لیے آخر  
سکون قلب ادھر بھی نہیں ادھر بھی نہیں



آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ رہیں جن پر  
اس کی مدھوش جوانی نے عنایت کی ہے  
کارروائی گزرنے ہیں جن سے اسی رعنائی کے  
جن کی ان آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوا گئیں جن میں اس کے ملبوس  
کی افرادہ مہک باقی ہے  
تجھ پر بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور  
جس میں بنتی ہوئی راتوں کی کمک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشائی، وہ رخسار، وہ ہونٹ  
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے  
تجھ پر اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں

تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہم پر مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے  
اتئے احسان کہ گناہوں تو گناہ نہ سکون  
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے  
جز تر ہے اور کو سمجھاؤ تو سمجھا نہ سکون  
عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی  
یاس و حرمان کے وکھ درود کے معنی سیکھے  
زیر وستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا  
سرد آہوں کے، رخ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے  
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں  
ناتوانوں کے نوالوں پر جھلتے ہیں عقاب  
بازو تو لے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت  
شاہراہوں پر غریبوں کا لہو بہتا ہے  
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اپتی ہے نہ پوچھ  
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے



تہائی

پھر کوئی آیا دل زارا نہیں کوئی نہیں  
راہرو ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا  
ڈھلن پکی رات، پھر نے لگا تاروں کا غبار  
لڑکھڑا لگے ایوانوس میں خوابیدہ چدائی  
سو گنی راستہ تک تک کے ہر اک راہگوار  
اجنبی خاک نے دھند لادیئے قدموں کے سراغ  
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے وینا و ایا غ  
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو  
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا





وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے  
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

آج ان کی نظر میں کچھ ہم نے  
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

فیض حبیل غم بھی ہو نہ سکی  
عشق کو آزمائے کے دیکھ لیا

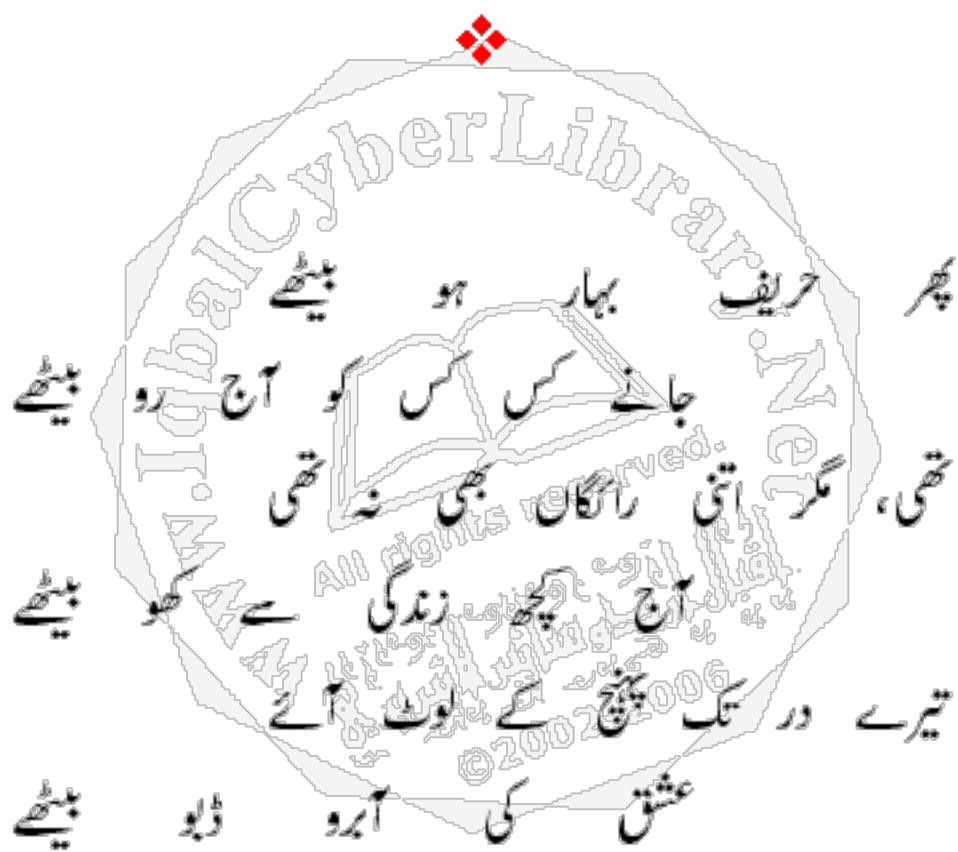




ماضی میں جو مزا مری شام و سحر میں تھا  
اب وہ فقط تصور شام و سحر میں ہے

کیا جانے کس کو کس سے ہے اب داد کی طلب  
وہ غم جو میرے دل میں ہے تیری نظر میں ہے





ساری دنیا سے دور ہو جائے  
 جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے  
 نہ گئی تیری بے رثی نہ گئی  
 ہم تری آزو بھی کھو بیٹھے  
 فیض ہتا رہے جو ہونا ہے  
 شعر لکھنے رہا کرو بیٹھے



# چند روز اور مرگی جان!

چند روز اور مرگی جان! فقط چند ہی روز  
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پر مجبور ہیں ہم  
اور کچھ دیر تھم سے میں، تکب لیں، رو لیں  
پڑھنے اچھا فائدہ کی میراث ہے مغذو رہا ہیں ہم  
جسم پر قید ہے، جذبات پر زنجیریں ہیں  
فلکر محبوب ہے، گفتار پر تعزیز ہیں

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی ہیے جاتے ہیں  
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں  
ہر گھری درد کے پیوند لگے جاتے ہیں  
لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں  
اک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں  
عرصہ دہر کی جلسی ہوئی ویرانی میں  
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے  
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ست  
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے  
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد  
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار  
چاندنی راتوں کا بے کار دکھتا ہوا درد

دل کی بے سود رُپ، جسم کی مایوس پکار  
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز



# مرگ سوز مجت

آؤ کہ مرگ سوز مجت منائیں ہم  
آؤ کہ حسن ماہ سے دل کو جلائیں ہم  
خوش ہوں فراق قامت و رخسار بیار سے  
سرمود گلی و سمن سے نظر کو ستائیں ہم  
دیرانی حیات کو چوڑیاں ترکیں  
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم  
پھر اوٹ لے کے دامن ابر بہار کی  
دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بھائیں ہم  
سلبھائیں بے دلی سے یہ الجھے ہوئے سوال  
واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم  
پھر دل کو پاس ضبط کی تلقین کر چکیں  
اور امتحان ضبط سے پھر جی چڑائیں ہم  
آؤ کہ آج ختم ہوئی داستان عشق  
اب ختم عاشقی کے فنانے سنائیں ہم



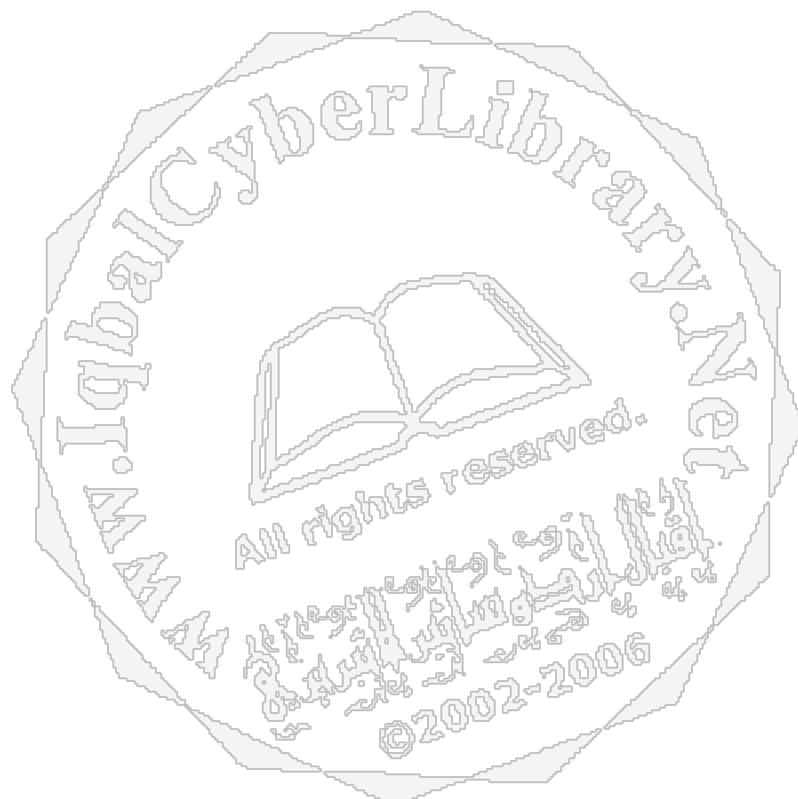


نہ آرام شب کو، نہ راحت سوریے  
 غلاظت میں گھر، نایوں میں بیسرے  
 جو بگریں تو اک دوسرے سے لڑا دو  
 ذرا ایک روئی کا تکڑا دکھا د  
 و

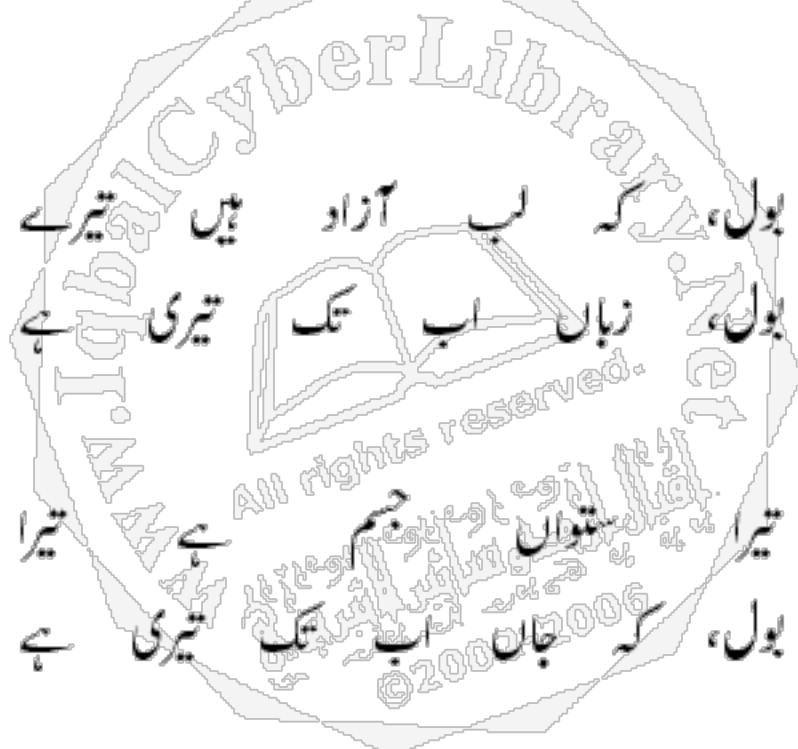
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے  
 یہ فاقوں سے اکتا کے مر جانے والے  
 یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھانے  
 تو انسان سب سر کشی بھول جائے

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں  
 یہ آقاوں کی ہڈیاں تک چبا لیں  
 کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے

کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے



بول



دیکھ کہ آہن گر کی دکان میں  
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے  
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

بول، یہ جھوڑا وقت بہت ہے  
جسم و زبان کی موت سے پہلے

بول کہ مج زندہ ہے اب تک  
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے!

♦♦♦



پھر لکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو  
کچھ کہتی ہے ہر راہ ہر اک راہگرد سے

وہ رنگ ہے امسال گلستان کی فضا کا  
او جمل ہوئی دیوار قفس حد نظر سے

ساغر تو کھلتے ہیں شراب آئے نہ آئے  
بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برے نہ برے

پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنجھا لو  
پایا ب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے



# اقبال

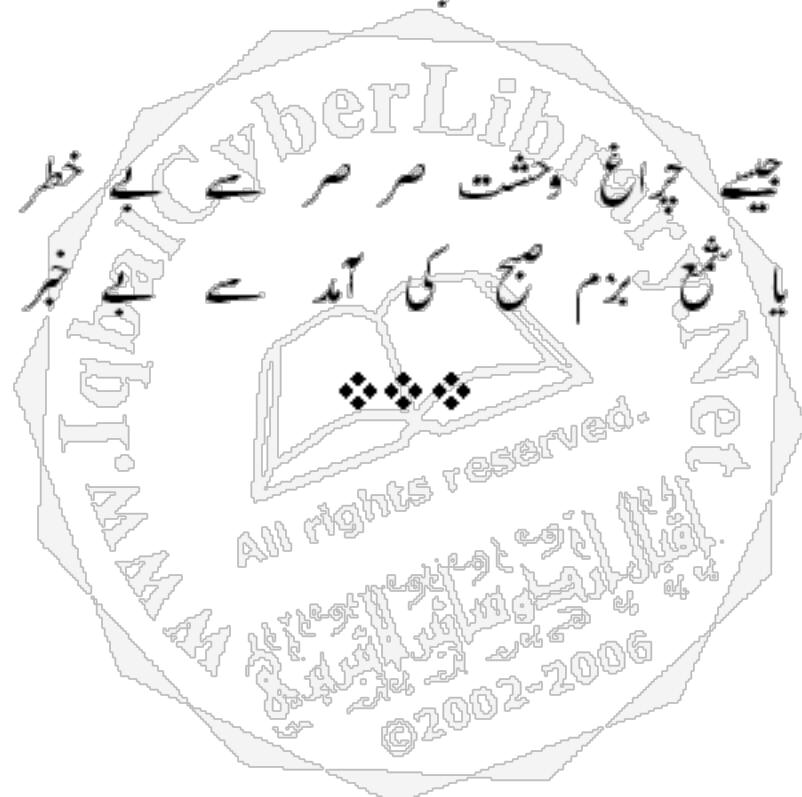
آیا ہمارے دلیں میں اک خوش نوا فقیر  
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا  
سمان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں  
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا  
تحمیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ گئیں  
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا

اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما  
اور پھر سے اپنے دلیں کی راہیں اواس ہیں

چند اک کو ایدہ ہے کوئی اس کی ادائے خاص  
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں  
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے  
اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال  
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز

یہ گیت مثل شعلہ جوالہ تند و تیز  
اس کی لپک سے باد فنا کا جگر گداز





نہیں جاتی متاع لعل و گوہر کی گراں یا بی  
متاع غیرت و ایماں کی ارزائی نہیں جاتی

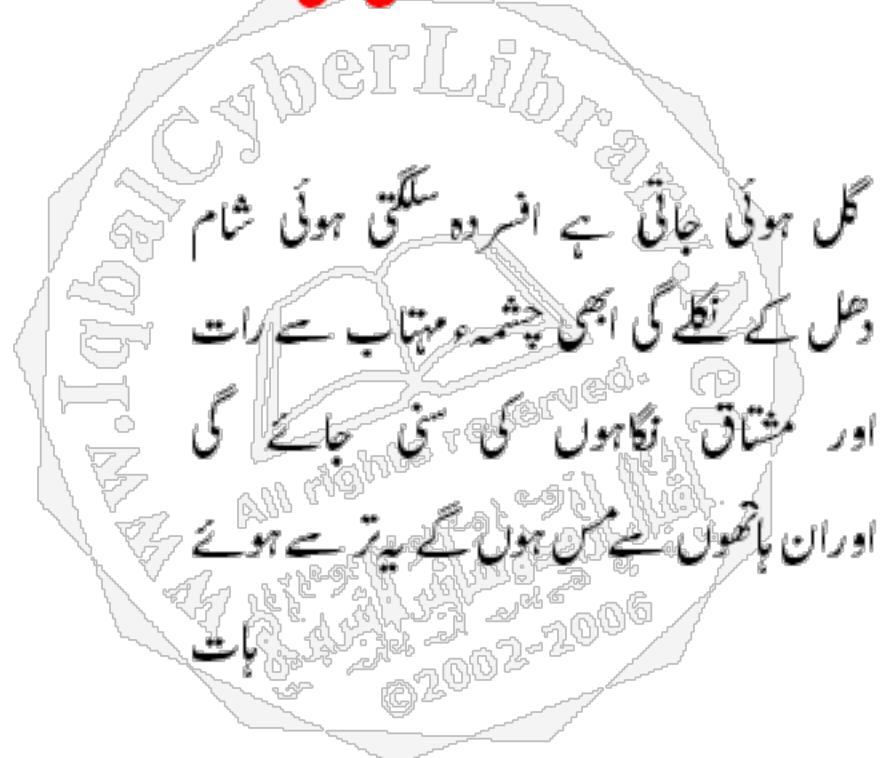
مری چشم تن آسائ کو بصیرت مل گئی جب سے  
بہت جانی ہوئی صورت بھی پچانی نہیں جاتی

سر خرو سے ناز کجھلا ہی چھن بھی جاتا ہے  
کلاہ خرو وی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟  
جهاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی



## موضوعِ سخن



ان کا آنچل ہے، کہ رخسار کے پیراں ہے  
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چمنِ نگیں  
جانے اس زلف کی موہومِ گھنی چھاؤں میں  
ٹمٹھاتا ہے وہ آوریہِ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حسنِ دل آرا کی وہی دھج ہو گی  
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر  
رنگِ رخسار پہ بُلکا سا وہ غازے کا غبار  
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی  
جانِ مضمون ہے یہی، شاہدِ معنی ہے یہی

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے  
 آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟  
 موت اور زیست کی روزانہ صفائی میں  
 ہم پہ کیا گزرنے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے؟  
  
 ان دلکش ہونے شہروں کی فراوان مخلوق  
 کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟  
 یہ سیئین کیتی، پھٹا پڑتا ہے جو بن جن کا!  
 کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پر اسرار کثری دیواریں  
 جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ  
 یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقلی گاہیں  
 جن کے پتو سے چڑا گاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے  
 لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ  
 ہائے اس جسم کے کم بخت دلاؤین خخطوط  
 آپ ہی کہنے کہیں ایسے بھی افسوس ہوں گے

اپنا موضوع خن ان کے سوا اور نہیں

طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور انہیں



ہم لوگ

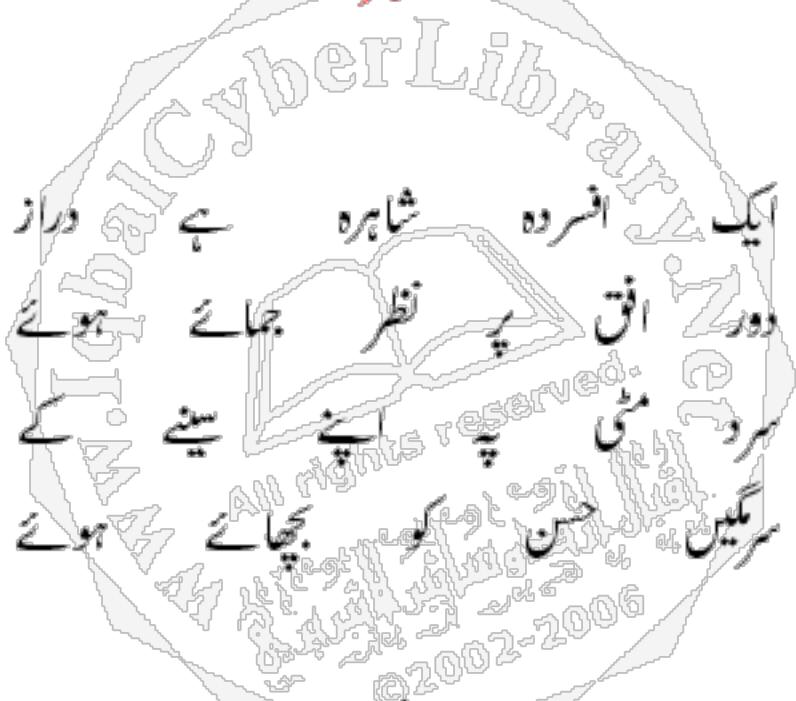
Cyber Library  
Del ke aiwal mei leye gull shde Shmeouon ki qtar  
Nur e Khurshid se hme hote aata hote hote  
Hsn mjhob ke sial tصور کی طرح  
Apni bhar keni ko hifz hote hote pista hote hote  
© 2002-2006  
All rights reserved.

غايت سود و زیال، صورت آغاز و مآل  
وہی بے سود تجسس، وہی بے کار سوال  
مضھل ساعت امروز کی بے رنگی سے  
یادِ ماضی سے غمیں، دشست فردا سے ندھاں

تشنه افکار جو تکین نہیں پاتے ہیں  
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں  
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں  
دل کے تاریک شگافوں سے لکھتا ہی نہیں  
اور اک الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش  
دشت و زندان کی ہوش، چاک گریباں کی تلاش

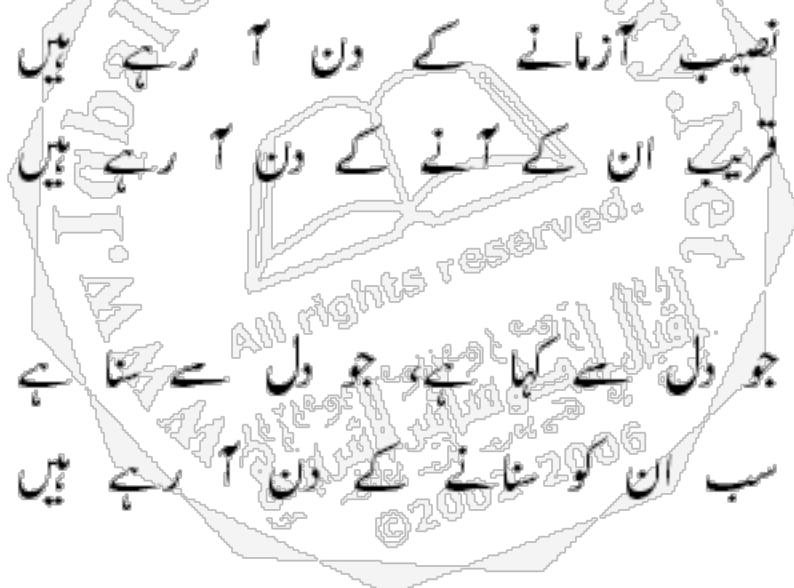


شہر راہ



جس طرح کوئی غزہ  
اورت  
اپنے ویاں کدے میں محو خیال  
وصل محبوب کے تصور میں  
مو بھو چورہ عضو عضو نہ حال





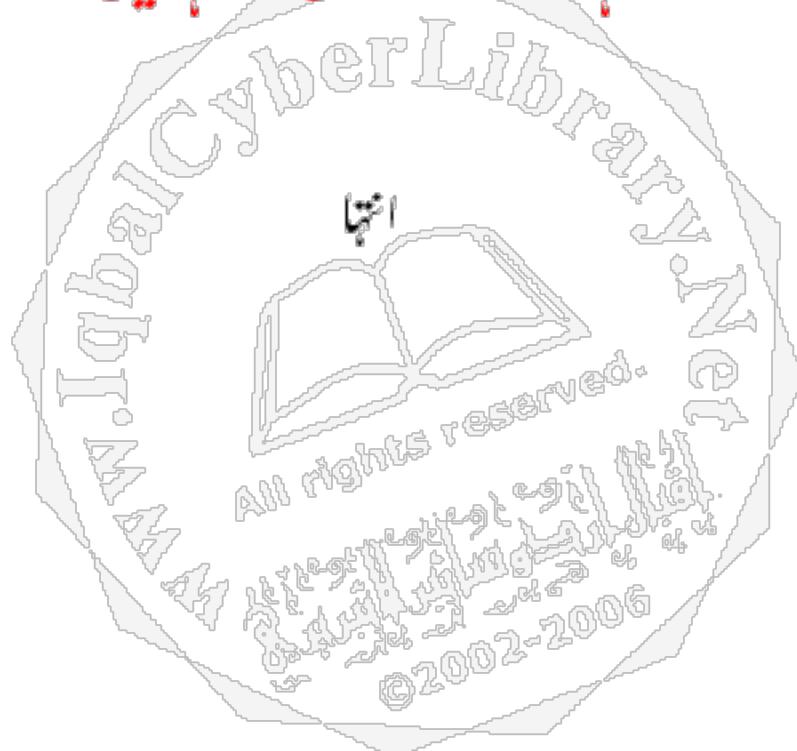
ابھی سے دل و جاں سر راہ رکھ دو  
کہ لئے لٹانے کے دن آ رہے ہیں

پکنے لگی ان نگاہوں سے مستی  
نگاہیں چرانے کے دن آ رہے ہیں

صبا پھر ہمیں پوچھتی پھر رہی ہے  
چمن کو سجائے کے دن آ رہے ہیں

چلو فیض پھر سے کہیں دل لگائیں

سماں ہے ملکا نے کے دن آرہے ہیں







ایک زمانہ ہوا جب غالب نے لکھا تھا کہ جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی  
و دیدہ بینا نہیں بچوں کا کھیل ہے۔ اگر غالب ہمارے تھم عصر ہوتے تو غالباً کوئی نہ کوئی  
ناقد ضرور پکار اٹھتا کہ غالب نے بچوں کے گھیل کی تو ہیں کی ہے، یا یہ کہ غالب ادب  
میں پروپیگنڈے کے عامی معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر کی آنکھ کو تو محض حسن سے غرض ہے اور  
حسن اگر قطرے میں دکھائی دے جائے تو وہ قطرہ دجلہ کا ہو یا گلی کی بدروکا، شاعر کو  
اس سے کیا سروکار، یہ دجلہ دیکھنا دکھانا حکیم، فلسفی یا سیاستدان کا کام ہو گا شاعر کا  
کام نہیں ہے۔

اگر ان حضرات کا کہنا صحیح ہوتا تو آبروئے شیوه اہل ہنر رہتی یا جاتی، اہل ہنر کا  
کام یقیناً بہت سہل ہو جاتا لیکن خوش قسمتی یا بد قسمتی سے فن سخن (یا کوئی اور فن) بچوں  
کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے تو غالب کا دیدہ بینا بھی کافی نہیں، اس لیے کافی نہیں  
کہ شاعر یا اویب کو قطرے میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے۔ مزید برآں  
اگر غالب کے دجلہ سے زندگی اور موجودات کا نظام مراد لیا جائے تو اویب خود بھی  
اسی دجلہ کا ایک قطرہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے ان گنت قطروں سے مل کر  
اس دریا کے رخ، اس کے بہاؤ، اس کی ہیبت اور اس کی منزل کے تعین کی ذمہ داری  
بھی اویب کے سر آن پڑتی ہے۔

یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گردو  
پیش کے مفطر بقطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی پیمائی پر ہے۔ اسے

دوسروں کو دکھانا اس کی فتنی دردرس پر، اس کے بہاؤ میں داخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور رہو کی حرارت پر۔

اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدو جہد چاہتے ہیں۔ نظام زندگی کسی حوس کا ظہر ہوا، سنگ بستہ، مقید پانی نہیں ہے جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نکاح احاطہ کر سکے۔ ووروراز اور جھل دشوار گز اڑپھاریوں میں بر قیس پھلتی ہیں، چشمے ابنتے ہیں، نندی نالے پھرول کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہم کنار ہوتے ہیں اور پھر یہ پانی لشما بڑھتا، واڈیوں، جنگلوں اور میدانوں میں سملتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ جس ویدہ بینا نے انسانی تاریخ میں زندگی کے یہ نقوش و مرامل نہیں دیکھے اس نے دجلہ کا کیا دیکھا ہے۔ پھر شاعر کی نکاح ان کا گزشتہ اور حالیہ مقامات تک پہنچ بھی گئی، لیکن ان کی منظر کشی میں طلاق ولب نے یا اوری نہ کی یا اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے جسم و جاں جدو طلب پر راضی نہ ہوئے تو بھی شاعر اپنے فن سے پوری طرح سرخونہیں ہے۔

غالباً اس طویل و عریض استعارے کو وزیر الفاظ میں بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیات انسانی کی اجتماعی جدو جہد کا ادراک، اور اس جدو جہد میں حصہ تو فیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔

فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فتنی جدو جہد اسی جدو جہد کا ایک پہلو ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے اس لیے طالب فن کے مجاہدے کا کوئی زوال نہیں۔ اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستغل کاوش۔

اس کوشش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی اپنی توفیق و استطاعت پر ہے۔ لیکن کوشش میں مصروف رہنا بہر طور ممکن بھی ہے اور لازم بھی۔

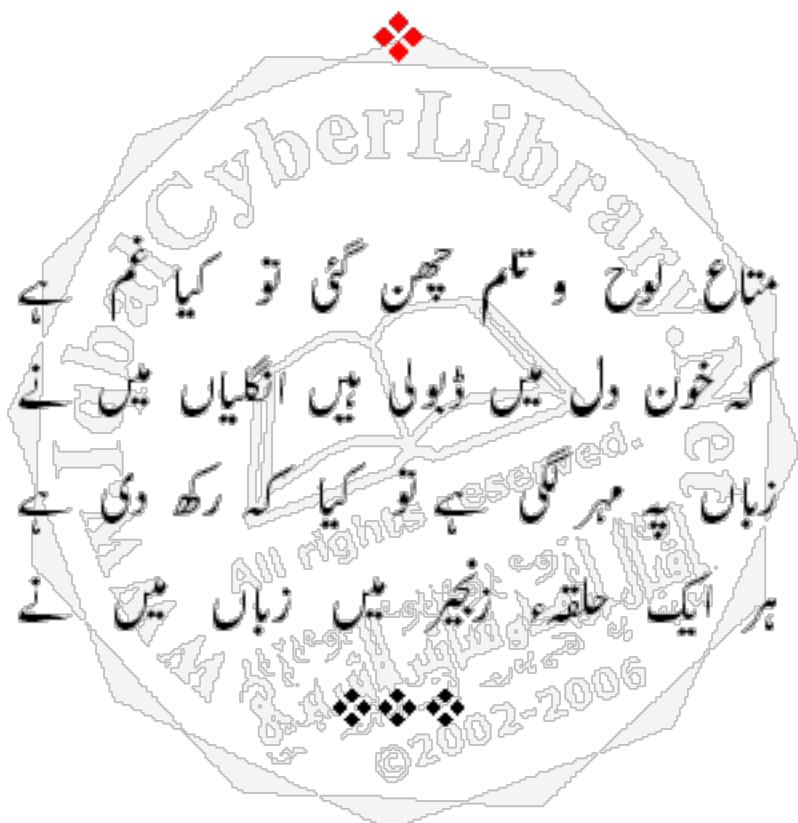
یہ چند صفحات بھی اس نوع کی ایک کوشش ہیں۔ ممکن ہے کہ فن کی غظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کے مظاہرے میں بھی نمائش یا تعلیٰ اور خود

پسندی کا ایک پہلو نکلتا ہو، لیکن کوشش کیسی بھی تغیر کیون نہ ہو، زندگی یا فن سے فرار اور شرمساری پر فاکٹ ہے۔

فیض

سنترل جیل حیدر آباد

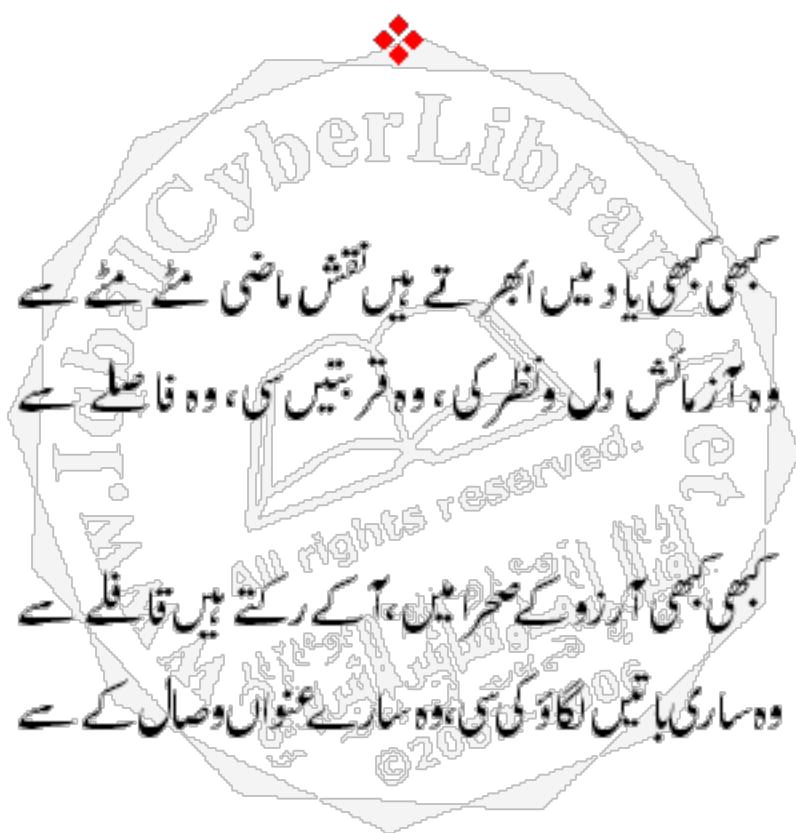




# اے دل بیتاب ٹھہر!

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے  
شب کی رگ لگ سے اب پھوٹ رہا ہو جیسے  
چل رہی ہے پکھا اس انداز سے نبض ہستی  
دونوں عالم کا نشر ثبوت رہا جو جیسے  
رات کا گرم آب اور بھی بجھ جانے والے  
یہی تاریکی تو ہے غازہ رخمار سحر  
صح ہونے ہی کو ہے اے دل بیتاب ٹھہر  
ابھی زنجیر چھکتی ہے پس پودہ ساز  
مطلق الحکم ہے شیرازہ اسہاب ابھی  
ساغر ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں  
لغزش پا میں ہے پابندی آداب ابھی  
اپنے دایاؤں کو دیوانہ تو بن لینے وہ  
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے وہ  
جلد یہ سلطوت اسہاب بھی اٹھ جائے گی  
یہ گرانباریء آداب بھی اٹھ جائے گی  
خواہ زنجیر چھکتی ہی، چھکتی ہی رہے





نگاہ و دل کو قرار کیا، نشاط و غم میں کمی کہاں کی  
وہ جب ملے ہیں تو ان سے ہر بار کی ہے افعت نہ سرے سے

بہت گراں ہے یہ عیش تنہا، کہیں سبک تر، کہیں گوارا  
وہ درد پہاں کہ ساری دنیا رفتی تھی جس کے واسطے سے

تمہیں کہورند و مختص میں ہے آج شب کون فرق ایسا  
یہ آکے بیٹھے ہیں میکدے میں وہ اٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

# سیاسی لائبریری کے نام

سالہاں سال یہ بے آسرا جگڑے ہوئے ہاتھ  
رات کے سخت و سیہے سینے میں پوسٹ رہے  
جس طرح تکا مخدر سے ہو سرگرم تیز  
جس طرح تیزی کھسپار پہ یلغار کرے  
اور اب رات کے گھنینڈے سیہے سینے میں  
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے  
جا بجا نور سے اک جال سا بن رکھا ہے  
دور سے صح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے  
تیرا سرمایہ، تری اسی بھی ہاتھ تو ہیں  
اور کچھ بھی تو نہیں پاس، بھی ہاتھ تو ہیں  
تجھ کو منظور نہیں غلبہ ظلمت، لیکن  
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں  
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن  
رات کی ہنی میت کے تلے دب جائے!



مرے ہمہ، مرے دوست

Cyber Library

گر مجھے اس کا یقین ہو مرے ہدم مرے دوست  
گر مجھے اس کا یقین ہو کہ ترے دل کی تھکن  
تیری آنکھوں کی طادا سی، ترے سینے کی جلن  
میری دل جوئی، مرے بیمار سے مٹ جائے گی  
گرم احرفِ تسلی وہ دوا ہو جس سے

جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ  
تیری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذلیل کے داغ  
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے

گر مجھے اس کا یقین ہو مرے ہدم مرے دوست  
روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں  
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے، شیریں  
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت  
آمد صح کے، مہتاب کے، سیاروں کے گیت  
تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں  
کیسے مغرور حسیناؤں کے بر قاب سے جسم  
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پکھل جاتے ہیں  
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش  
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدلت جاتے ہیں

کس طرح عارض محبوب کا شفاف بلور  
یک بیک بادہ اہم سے دیک جاتا ہے  
کیسے گلچیں کے لیے جھلتی ہے خود شاخ گلاب  
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے  
یونہی گاتا رہوں، گاتا رہوں تیری خاطر  
لیت پہنچا رہوں، پیٹھا رہوں تیری خاطر  
پمرے گیت ترتے و کھلاد او اہنی نہیں  
لغہ جراح نہیں، موسیٰ روح غم خوار ہی  
گیت نشرت تو ۰۲۰۵۰۷۲۰۰۶  
تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشرت کے سوا  
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں  
اس چہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں  
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا





یہ دلخواہ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر  
 وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں  
 یہ وہ سحر تو نہیں، جس کی آرزو لے کر  
 چلے تھے یا پر کہاں جائے کی میں نہ کہیں  
 فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل  
 کہیں تو ہو گا شب سوت موج کا ساحل  
 کہیں تو جا کے رکے گا سفینہ غم دل

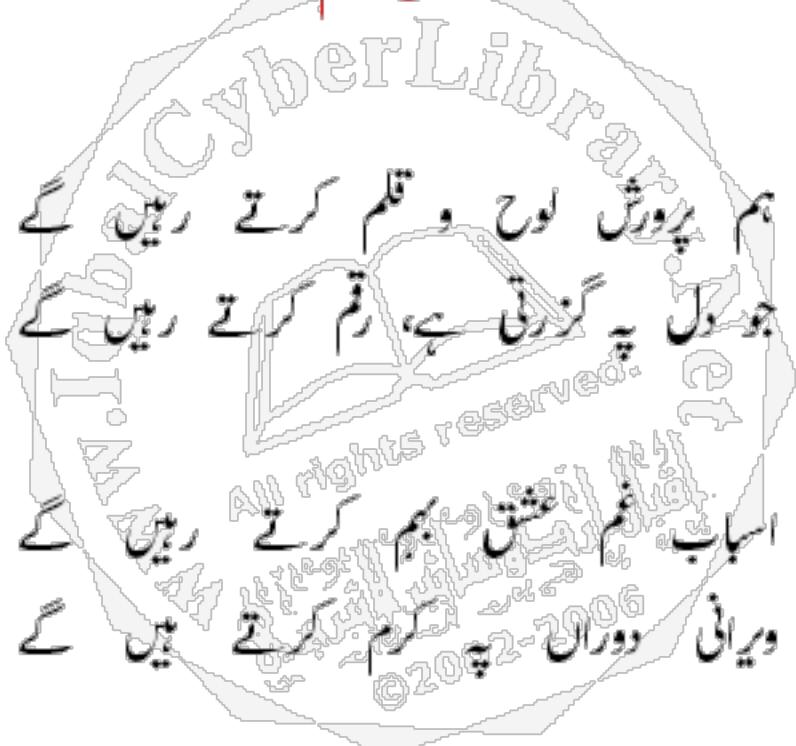
جوں لہو کی پر اسرار شاہراہوں سے  
 چلے جا یار تو دامن پر کتنے ہاتھ پڑے  
 دیار حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے  
 پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے  
 بہت عزیز تھی لیکن رُخ سحر کی لگن  
 بہت قریں تھا حسینان نور کا دامن  
 سبک سبک تھی تمناء، دلبی دلبی تھی صحکن

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراق ٹلمت و نور  
 سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصال منزل و گام

بدل چکا ہے بہت اہل درد کا دستور  
نشاط وصل حلال و عذاب بھر حرام  
جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن  
کی پچھے اثر ہی نہیں  
کہاں سے آئی نکار صباء کدھر کو گئی  
ابھی چجائے سر کو پچھے خبر نہیں  
ابھی گرفتی شب میں کمی نہیں آئی  
نجات دیدہ دل کی گھری نہیں آئی  
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی



لوح و قلم



ہاں تلخیٰ ایام ابھی اور بڑھے گی  
ہاں اہل ستم، مشق ستم کرتے ہیں گے

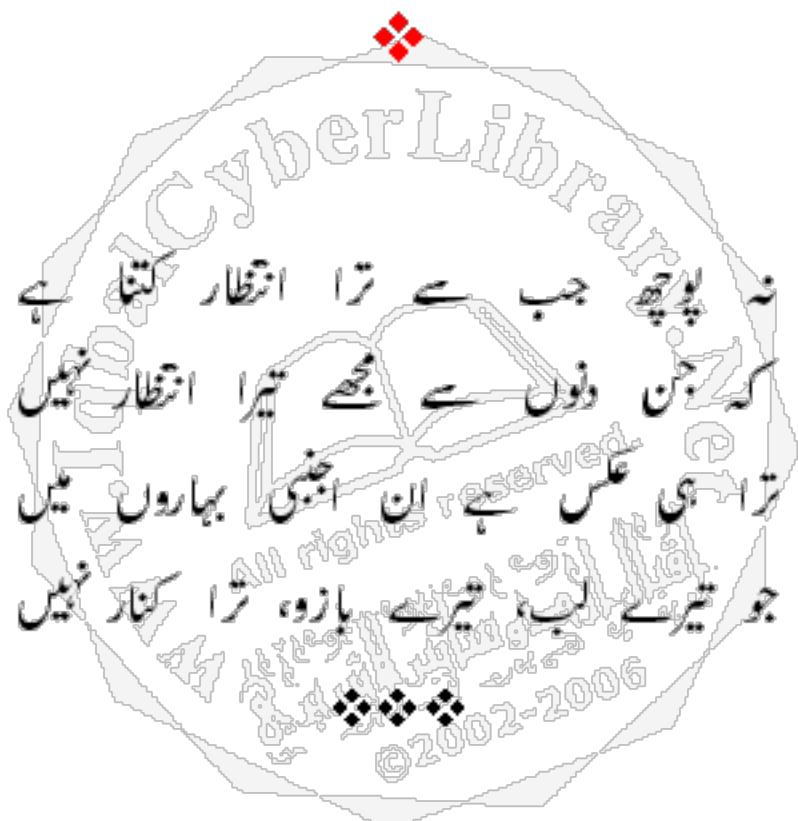
منتظر یہ تلخیٰ، یہ ستم ہم کو گواہا  
دم ہے تو مداوائے الہ کرتے ہیں گے

مے خانہ سلامت ہے، تو ہم سرفی مے سے  
ترین در و بام حرم کرتے رہیں گے

باتی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا  
رنگ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے

اک طرز تفافل ہے سو وہ ان کو مبارک  
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے





جبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی  
خبر خبر کے یہ ہوتا ہے اُج دل کو گماں  
وہ ہاتھ ڈھونڈ رہے ہیں بیان مھفل میں  
کہ دل کے واغ گماں ہیں نشت ورد کہاں

All rights reserved.

© 2002-2006

# شورش بربادون



پہلی آواز

اب سے کیا امکاں اور نہیں پرواز کا مضموم ہو بھی چکا  
تاروں پر کنڈیں پھینکیں چک، مہتاب پر بشنوں ہو بھی چکا  
اب اور کسی فردا کے لیے ان آنکھوں سے کیا پیاس کیجیے  
کس خواب کے جھوٹے افسوس سے تسلیم دل نا وال کیجیے  
شیرینی لب، خوشبوئے وہن اب شوق کا عنوان کوئی نہیں  
شاوابی دل، تفریح نظر، اب زیست کا درماں کوئی نہیں  
جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں الجھ کر کیا لیں گے  
اک موت کا دھندا باقی ہے، جب چاہیں گے نپنا لیں گے  
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری لحد ہے



## دوسرا آواز

ہستی کی متاثع بے پایاں، جا گیر تری ہے نہ میری ہے  
اس بزم میں اپنی مشعل دل، ہمل ہتو کیا، رخشاں ہے تو کیا  
یہ بزم چھا قاں رہتی ہے، اک حاق اگر ویراں ہے تو کیا  
افسر دہ بیس اگر بایام تڑپے بدال غبیس مسلک شام و سحر  
ٹھہرے غبیس موسم گل کے قدم، قائم ہے جمال شمس و قمر  
آباد ہے وادی کا کل و لب، شہزاداب و حبیس گلگشت نظر  
مقسم ہے لذت درو جگر، موجود ہے نعمت دیدہ تر  
اس دیدہ تر کا شکر کرو، اس ذوق نظر کا شکر کرو  
اس شام و سحر کا شکر کرو، ان شمس و قمر کا شکر کرو



گر بھے یہی مسلک شمس و قمر، ان شمس و قمر کا کیا ہو گا  
 رعنائی شب کا کیا ہو گا، انداز سحر کا کیا ہو گا  
 جب خون جگر فاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہوں گیں  
 اس دیدۂ بر کا کیا ہو گا، اس ذوقِ نظر کا کیا ہو گا  
 جب شعر کے نئے راکھ جو نغمتوں کی طنابیں لوت گئیں  
 یہ ساز کھاں سر پھوڑیں گے، اس ملک گھر کا کیا ہو گا  
 جب سنج نفس مسکن بھرا، اور جیب و گریاں طوق و رسن  
 آئے کہ نہ آئے موسم گل، اس درد جگر کا کیا ہو گا



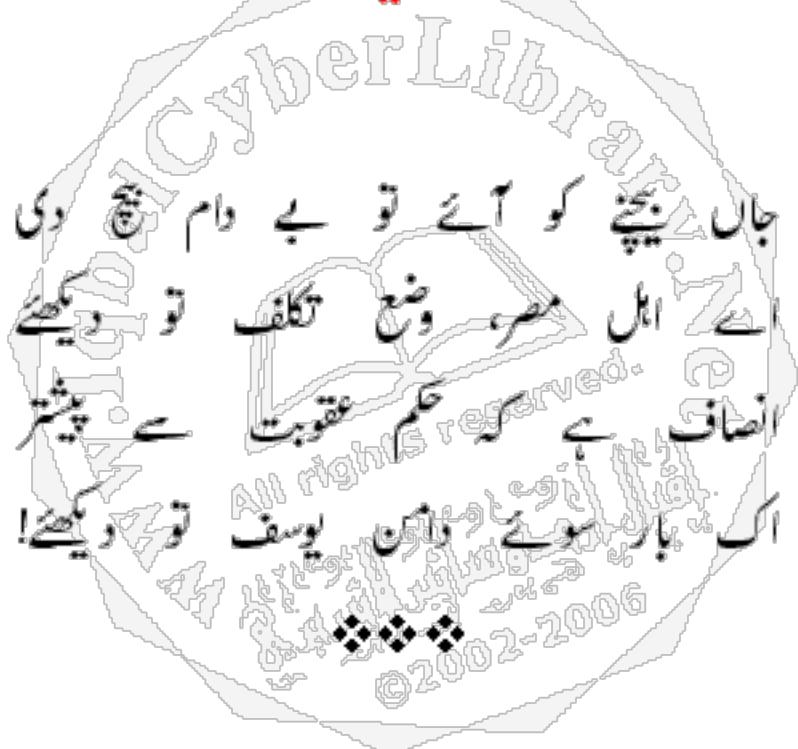
## دوسرا آواز

Cyber Library

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خون میں حرارت ہے جب تک  
اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جب تک  
ان طوق و ملاسل کو ہم تم، سکھائیں گے شورش بر بڑا نے  
وہ شورش جس کے آگے زبول ہنگامہ طبلی قیصر و کے  
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل پھر پور خذینہ ہمت کا  
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت امروز ہے اپنا ہر فردا  
یہ شام و سحر یہ نیش و قمر، یہ اخت و کوکب اپنے ہیں  
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں



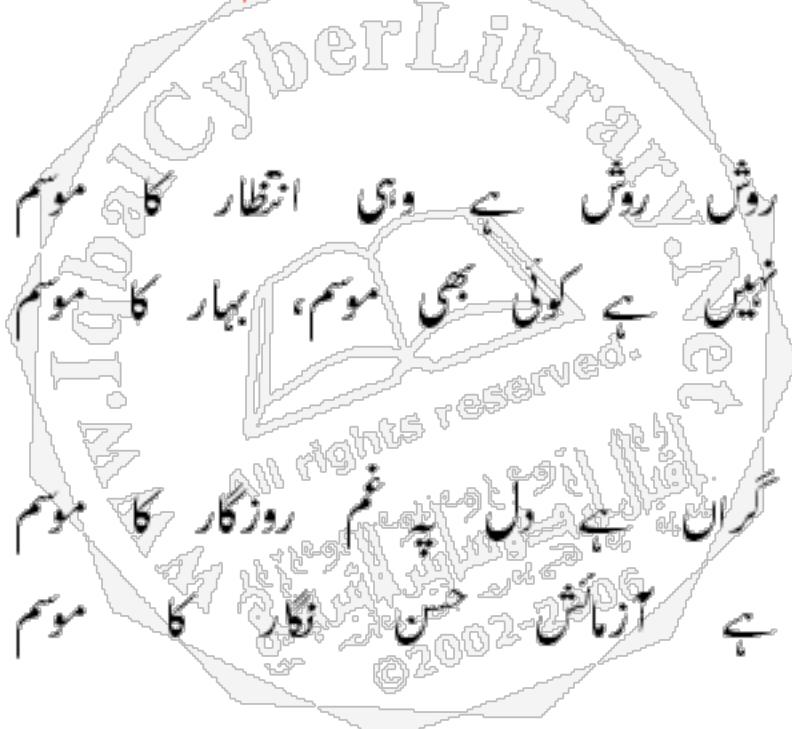
دامن یوسف



پھر خشکے سامان ہوئے ایوان ہون میں  
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہکار کھڑے ہیں  
ہاں جرم و فنا دکھیے کس کس پر ہے ثابت  
وہ سماں کے خطاء کار سردار کھڑے ہیں

All rights reserved.  
© 2002-2006

# طوق و دار کا موسਮ



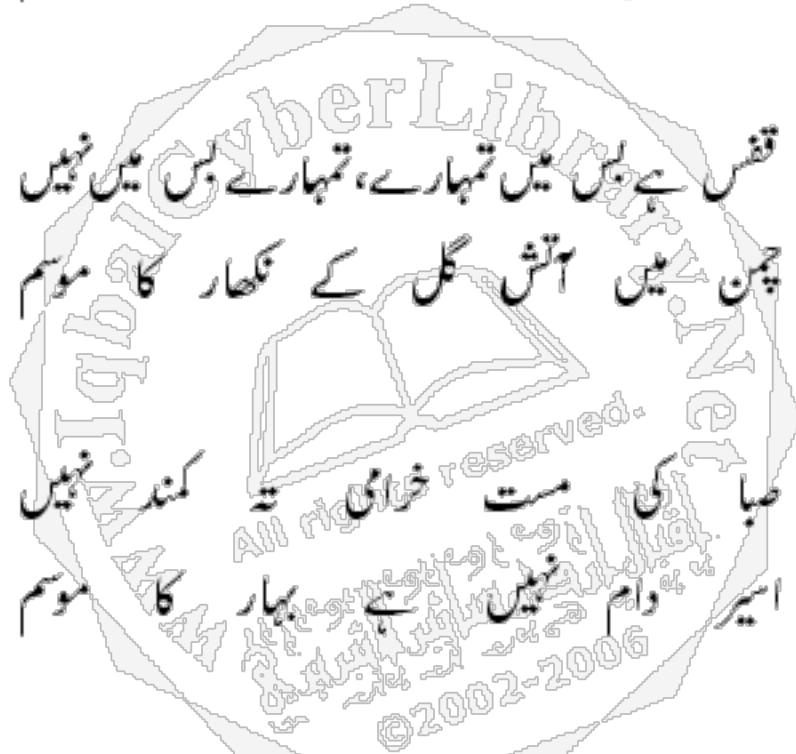
خوش نظارة رخسار یار کی ساعت  
خوش قرار دل بے قرار کا موسوم

حدیث بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف  
خرام اب سر کوہسار کا موسوم

نصیب صحبت یاراں نہیں تو کیا کیجیے  
یہ رقص سایہ سرو و چنار کا موسوم

یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم  
کچھ اب کے اور ہے ہجران یار کا موسوم

یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم  
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم

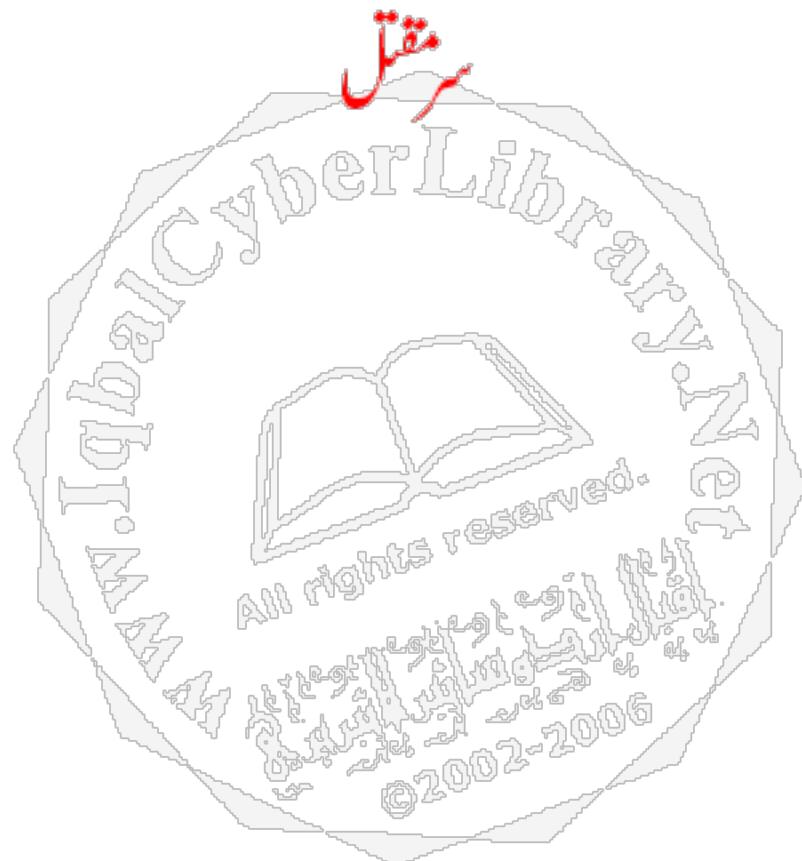


بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے  
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم





تر جمال نماں میں لے کے اخاں ہوں  
کھڑھائی ہے فنا تیرے پیداں کی سی  
نشیم تیرے شبستان سے ہو کے آئی ہے  
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی



(قوالی)

کہاں سے ہے منزل راہ تمنا، ہم بھی دیکھیں گے  
یہ شب ہم پر بھی گزرے گی، یہ فردا ہم بھی دیکھیں  
گے

ٹھہرائے دل، جمالِ روفے زیبا، ہم بھی دیکھیں گے  
ڈرائیٹنل تو ہموڑے لے شفی بادہ گساروں کی  
دبار کھیں گے کب تک جوش صہبا، ہم بھی دیکھیں گے  
اٹھار کھیں گے کب تک جام و مینا، ہم بھی دیکھیں گے  
صلاؤ تو چکے محفل میں اس کوئے ملامت سے  
کے روکے گا شور پند بے جا، ہم بھی دیکھیں گے  
کے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا، ہم بھی دیکھیں  
گے

چلے ہیں جان واپس آزمائے آج دل والے  
وہ لاکیں لشکر اغبار و اعداء، ہم بھی دیکھیں گے  
وہ آکیں تو سر مقل، تماشا ہم بھی دیکھیں گے  
یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہدم  
جو اس ساعت میں پنهان ہے اجالا، ہم بھی دیکھیں گے  
جو فرق صح پر چکے گا تارا، ہم بھی دیکھیں گے



Cyber Library

تم آئے ہو، نہ شب انتظار گزری ہے  
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے  
جنون میں جتنی بھی گزری، بلا کار گزری ہے  
اگرچہ دل خرابی پر اگر گزری ہے  
ہوئی ہے حضرت ناصحؒ کے اقتضاؤ جس شب  
وہ شب ضرور سر کوئے یار گزری ہے  
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا  
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے  
نہ گل کھلے ہیں، نہ ان سے ملے، نہ مے پی ہے  
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے  
چمن پہ عارت ٹھیکیں سے جانے کیا گزری ہے  
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

♦♦♦

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں  
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں  
حدیث یاد کے عنوان نظرنے لگتے ہیں  
تو ہر ہر یوم میں کیسوں سورے لگتے ہیں  
ہر اجنبی میں محرم و کھانی دیتا ہے  
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں  
جا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکر وطن  
تو چشم صح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں  
وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق والب کی بجیہ گری  
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں  
در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے  
تو فیض دل میں ستارے اتنے لگتے ہیں







یہ ضد ہے یادِ حریقانِ بادہ پیا کی  
کہ شب کو چاند نہ لٹکے، نہ دن کو ابر آئے

صبا نے پھر در زندگی پر آ کے دی دستک  
محر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبراۓ

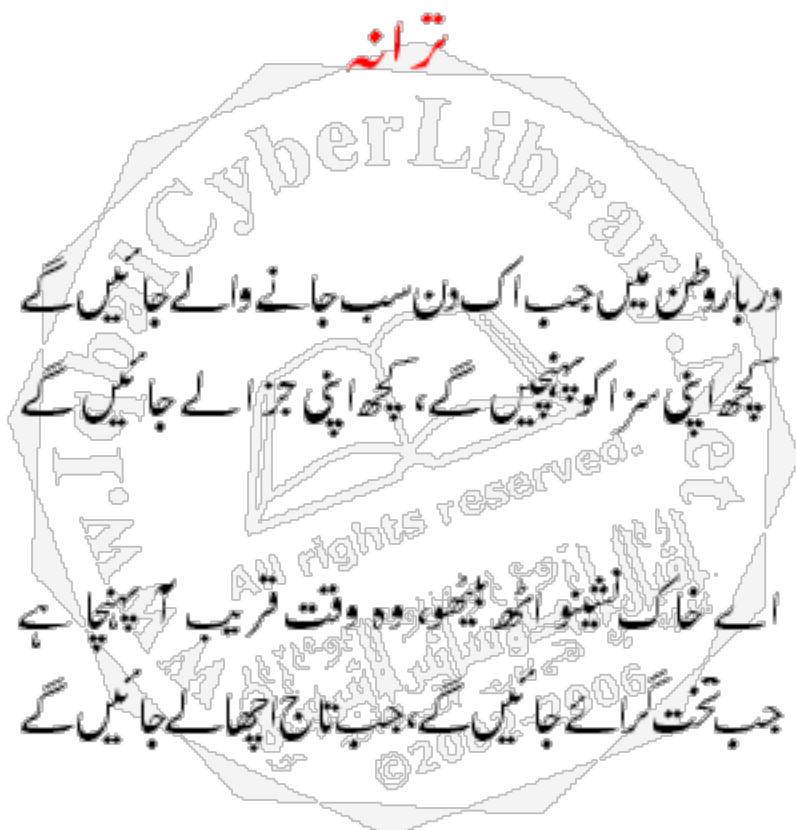


# تمہارے حسن کے نام

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام  
بکھر گیا جو کبھی رنگ پیر ہن سر بام  
کھڑ گئی ہے کبھی صبح، دوپہر، کبھی شام  
کہیں جو قامتِ زیبا، چوچ گئی ہے قبا  
چمن میں مروج صنوبر سنور گے بین تمام  
بنی بساطِ غزل جب ڈبو لیے دل نے  
تمہارے سایہِ رخسار و لب میں ساغر و جام  
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام!

تمہارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک  
جهاں میں باقی ہے دلداری عروسِ سخن  
تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے نلک  
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوانے وطن  
اگرچہ نلک میں اوقات، سخت میں آلام  
تمہاری یاد سے شیریں ہے تنخی ایام  
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام!





اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں  
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ لے جائیں گے

کلتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، ہر بھی بہت  
چلتے بھی چلو، کہاب ڈیرے منزل ہی پڑالے جائیں گے

اے قلم کے ما تو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک  
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے





بزمِ ثبوت کے خوش لشینوں سے  
عہمتِ چشمِ نم کی بات کرو

ہے وہی بات یوں بھی اور یوں بھی  
تمِ ستم یا کرم کی بات کرو

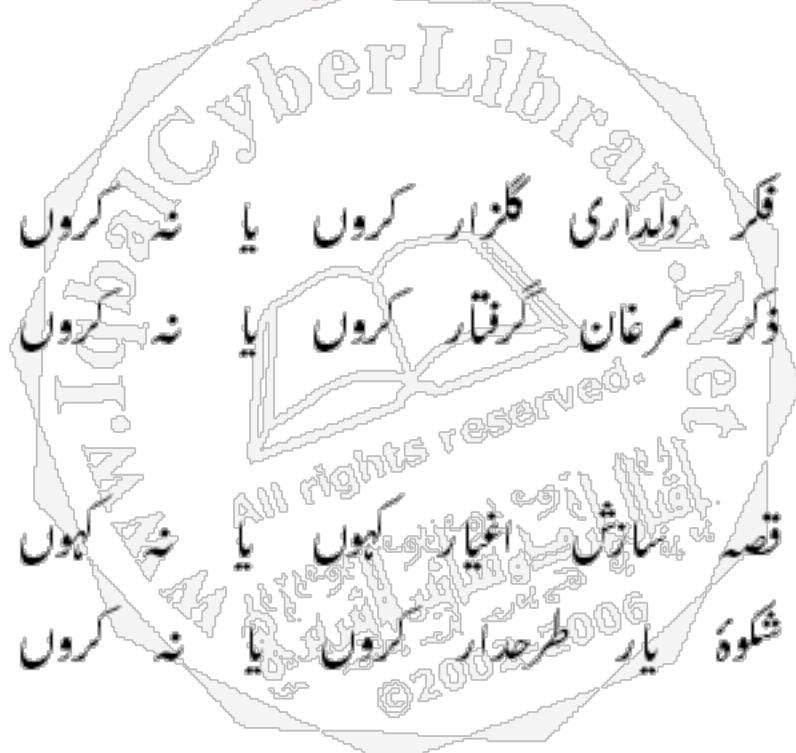
خیر میں اہل دیر جیسے ہیں  
آپ اہل حرم کی بات کرو

بھر کی شب تو کٹ ہی جائے گی  
روزِ وصلِ صنم کی بات کرو

جان جائیں گے جانے والے  
فیض، فرہاد و جم کی بات کرو



(نذر سودا)



جانے کیا وضع ہے اب رسم وفا کی اے دل  
وضع دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہل ہوں  
مدح زلف و لب و رخمار کروں یا نہ کروں

یوں بہار آئی ہے امسال کے گلشن میں صبا  
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں

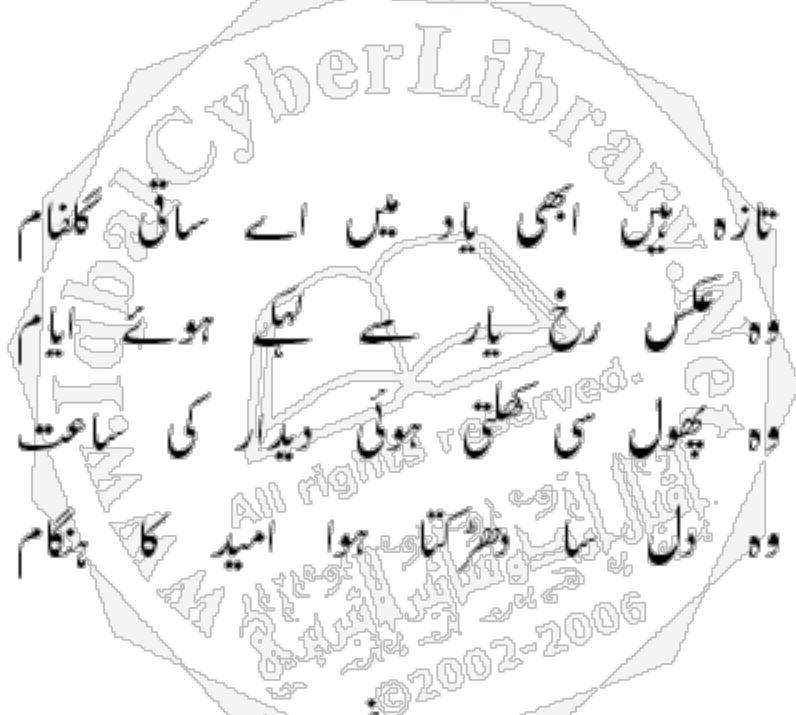
گویا اس سوچ میں ہے دل میں ابوجھر کے گلاب  
دامن و جیب کو گنار کروں یا نہ کروں

ہے فقط مرغ غزل خوان کے جسے فکر نہیں  
معتدل گرمی گفتار کروں یا نہ کروں





(□)



امید کہ لو جا گا غم دل کا نصیبہ  
لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہو گئی آخر  
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے  
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر

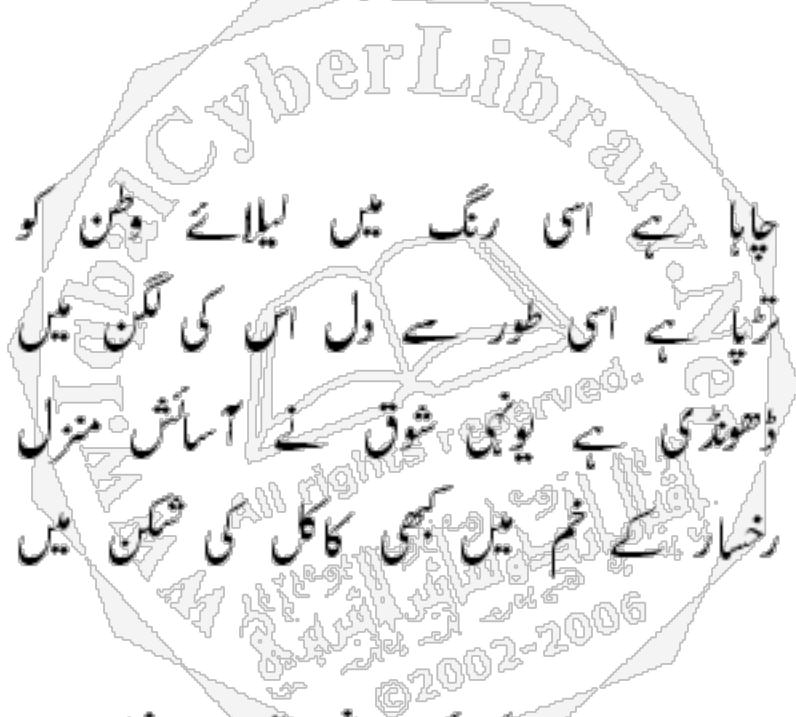
اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید  
اس سخن سے پھولے گی کرن رنگ حنا کی  
اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماں  
اس راہ پ پھولے گی شفق تیری قبا کی

پھر دیکھے ہیں وہ بھر کے پتے ہوئے دن بھی  
جب فکر دل و جان میں فغاں بھول گئی ہے  
ہر شب و سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے

ہر صحیح کی لو تیر سی سینے میں گلی ہے

تنهائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے  
کیا کیا نہ دل زار نے ڈھونڈا ہیں پناہیں  
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دست اسما کو  
ڈالی ہیں کبھی گرون مہتاب میں باہیں

All rights reserved  
© 2002-2006



چاہا ہے اسی رنگ میں لیالے و مہن کو  
ترپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں  
ڈھوندی ہے یونہی شوق نے آسائش منزل  
رخسار کے خم میں کبھی کامل ہی شکن میں

اس جان جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے  
ہنس ہنس کے صدا دی، کبھی رو رو کے پکارا  
پورے یئے سب حرف تنا کے تقاضے  
ہر درد کو اجیالا، ہر اک غم کو سنوارا

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا  
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی  
خیریت جا، راحت تن، صحت داماں  
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری  
تنہا پس زندگی، کبھی رسوا سر بازار  
گر جے ہیں بہت شیخ سرگوشہ منبر

کڑ کے ہیں بہت اہل حکم بر سر دربار

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناواک دشنام  
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرز ملامت  
اس عشق، نہ اس عشق پر نادم ہے مگر دل  
ہر راغبے اس دل میں بجز داع نداامت

All rights reserved.  
© 2002-2006



جگہ جگہ پتھے ناص تو کو بکار  
انہیں پسند، انہیں ناپسند کیا کرتے

ہمیں نے روک لیا، پنجھ جنوں ورنہ  
ہمیں اسیر یہ کوتہ کمند کیا کرتے

جنہیں خرچھی کہ شرط نواگری کیا ہے  
وہ خوش نوا گلہ قید و بند کیا کرتے

گلوئے عشق کو دار و رن پیش نہ سکے  
تو لوٹ آئے ترے سر بلند، کیا کرتے!



وہیں ہے دل کے قرآن تمام کہتے ہیں  
 وہاں خلش کر جسے تیرا نام کہتے ہیں  
 تم اُجھے ہو اک بھتی ہیں میری زخمیں  
 نہ جانے کیا مرے دیواروں پام کہتے ہیں

یہی کنار نلک کا سیہ تریں گوشہ  
 یہی ہے مطلع ماہ تمام کہتے ہیں

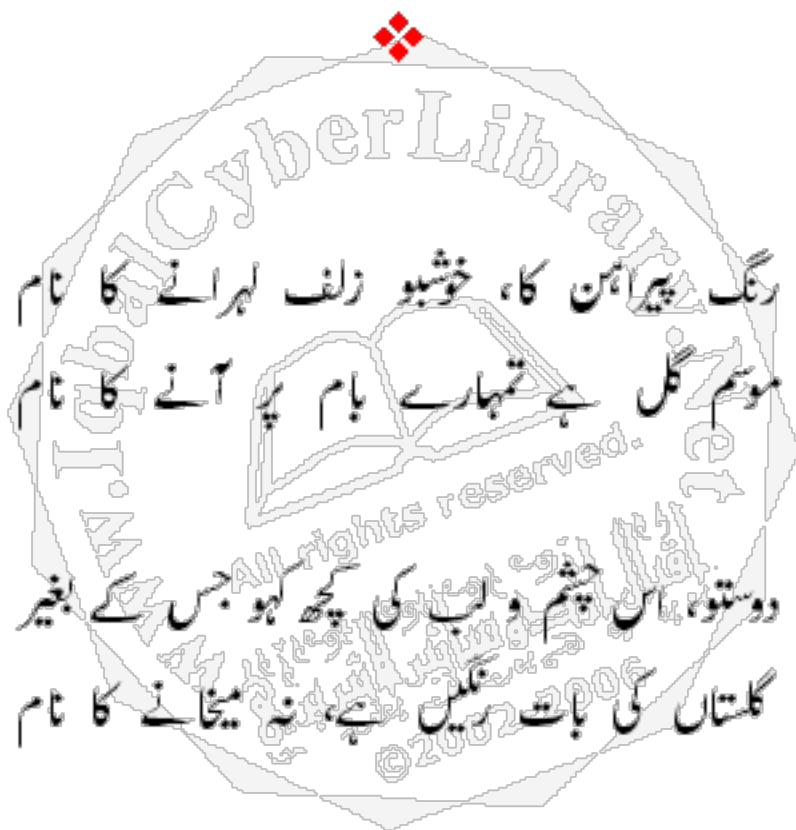
پو کہ مفت لگا دی ہے خون دل کی کشید  
 گراں ہے اب کے منے لالہ فام کہتے ہیں

فقیہ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں  
 کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیان چمن  
 کھلے نہ پھول، اسے انظام کہتے ہیں

کہو تو ہم بھی چلیں فیض، اب نہیں سردار  
وہ فرق مرتبہ خاص و عام، کہتے ہیں





پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں  
پھر تصور نے لیا اس زم میں جانے کا نام



(ق)

دبری بھرا زبان خلق سخوانے کا نام  
اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام  
اب کسی یلیٰ کو بھی اقرارِ محبوی نہیں  
ان دونوں بدمام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے  
رمد کا، ساتی کا، مے کا، خم کا، پیانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبان چمن!  
تم کوئی اچھا سارکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں  
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

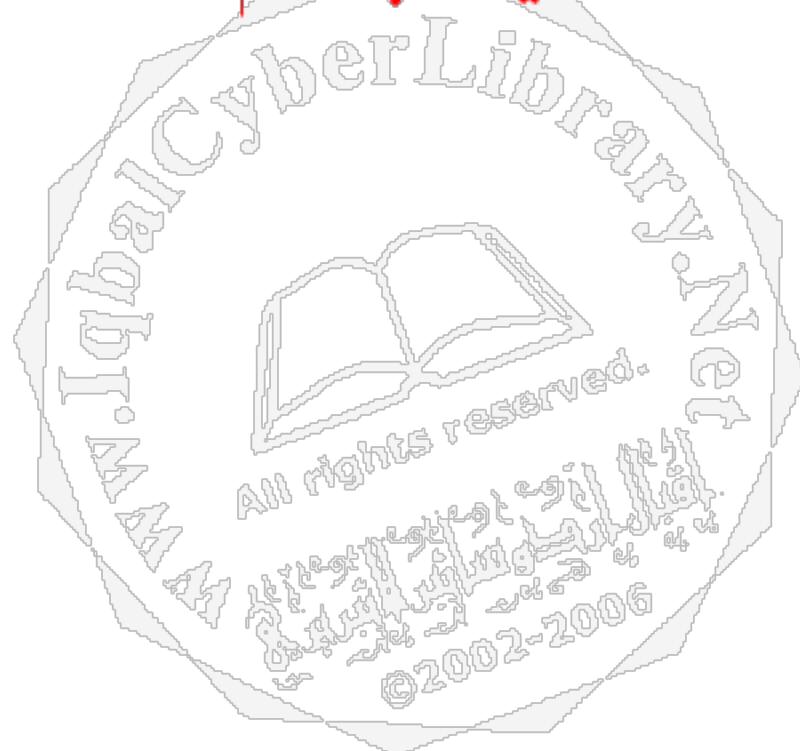


نوح

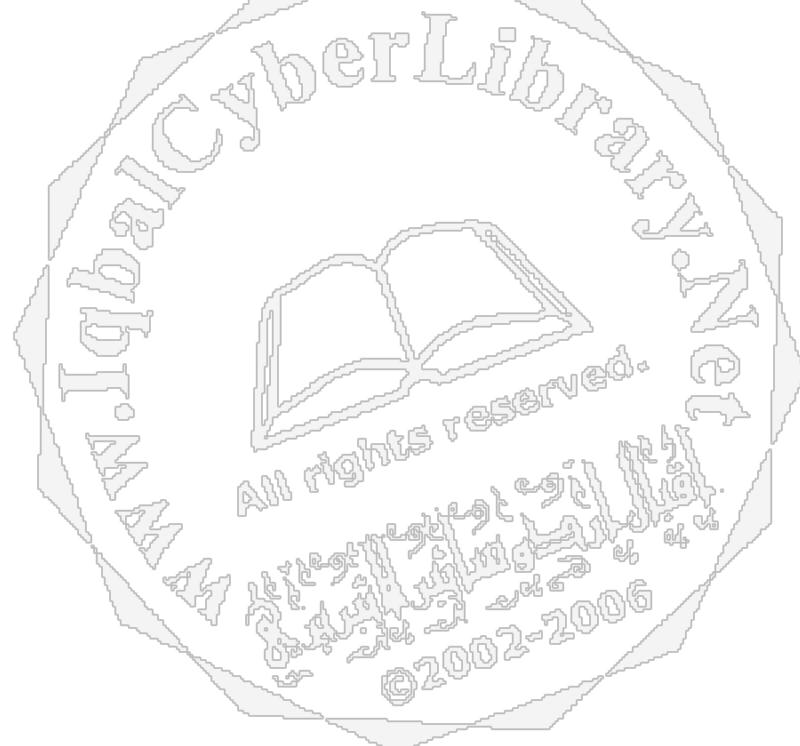
مجھ کو شکوہ ہے میرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے  
لے گئے ساتھ مری عمر گزشتہ کی کتاب  
اس میں تو میری بہت قصتی تصویریں تھیں  
اک میں مجھ پن تھا مرا اور مرا عہد شباب  
اس کے بد لے مجھے تم وے گئے جاتے جاتے  
اپنے غم کا یہ دملتا ہوا خون رنگ گلاب  
کیا کروں بھائی، یہ اعزاز میں کیونکر پہنؤں  
مجھ سے لے لو مری سب چاک قیصوں کا حساب  
آخری بار ہے، لو مان لو اک یہ بھی سوال  
آج تک تم سے میں لونا نہیں مایوس جواب  
اکے لے جاؤ تم اپنا یہ دملتا ہوا پھول  
مجھ کو لونا وہ مری عمر گزشتہ کی کتاب



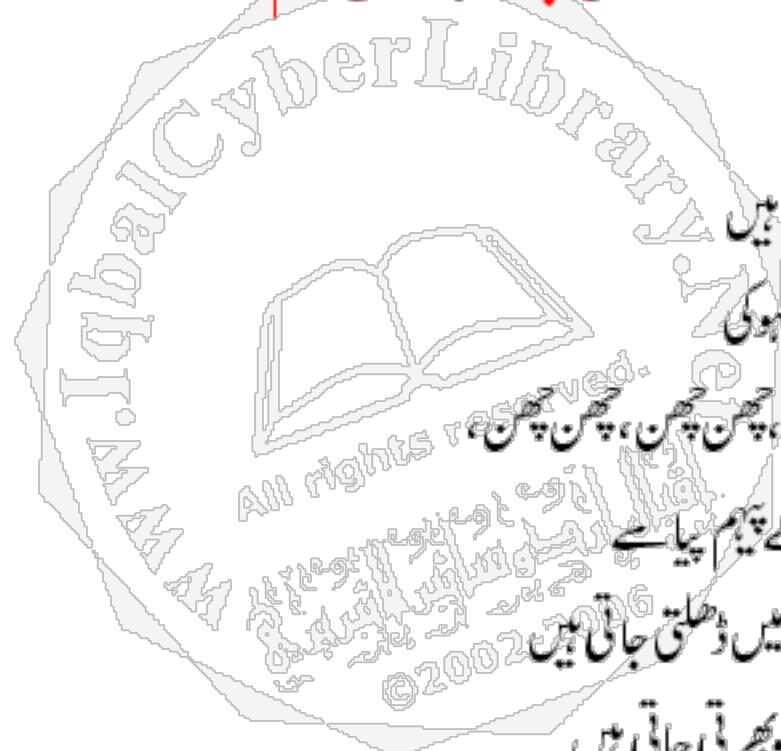
ایرانی طلبہ کے نام



جوامن اور آزادی



کی جدوجہد میں کام آئے



یہ کون تھی ہیں  
جن کے اہوکی

اشرفیاں، چمن چمن، چمن چمن  
دھرتی کے پاہم پیاسے ہے  
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں  
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں

یہ کون جواں ہیں ارض عجم  
یہ لکھ لٹ

جن کے جسموں کی  
بھرپور جوانی کا کندن

یوں خاک میں رینہ رینہ ہے  
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے  
اے ارض عجم، اے ارض عجم!

کیوں نوچ کے نہ نہ پھینک دئے  
ان آنکھوں نے اپنے نیلم  
ان ہوٹوں نے اپنے مر جاں  
ان ہاتوں کی بے گل چاندی  
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟

اے پوچھنے والے پر دیکی!

یہ طفول جواں

اس نور کے نور موتی ہیں

اس آگ کی کچی گلیاں ہیں

جس میٹھے نور اور گڑوی آگ

سے قلم کی اندر گھی رات میں پھونٹا

صحیح بغاوت کا لشکن

اور صحیح ہوئی مرن، تمن،

ان جسموں کا چاندی سونا

ان چہروں کے نہم، مر جاں،

جگ گ جگ، رخشاں رخشاں،

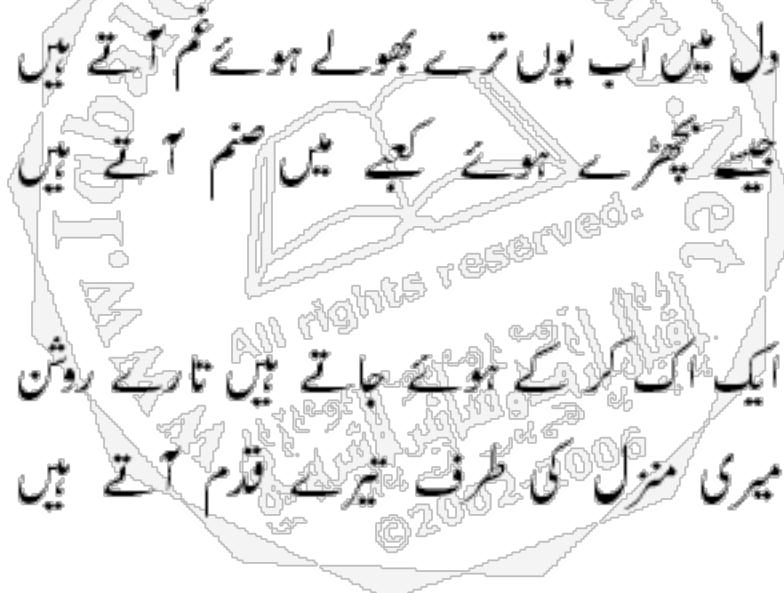
جو دیکھنا چاہے پر دیکی

پاس آئے دیکھے جی بھر کر

یہ زیست کی رانی کا جھومر

یہاں مرن کی دیوی کا لگن!





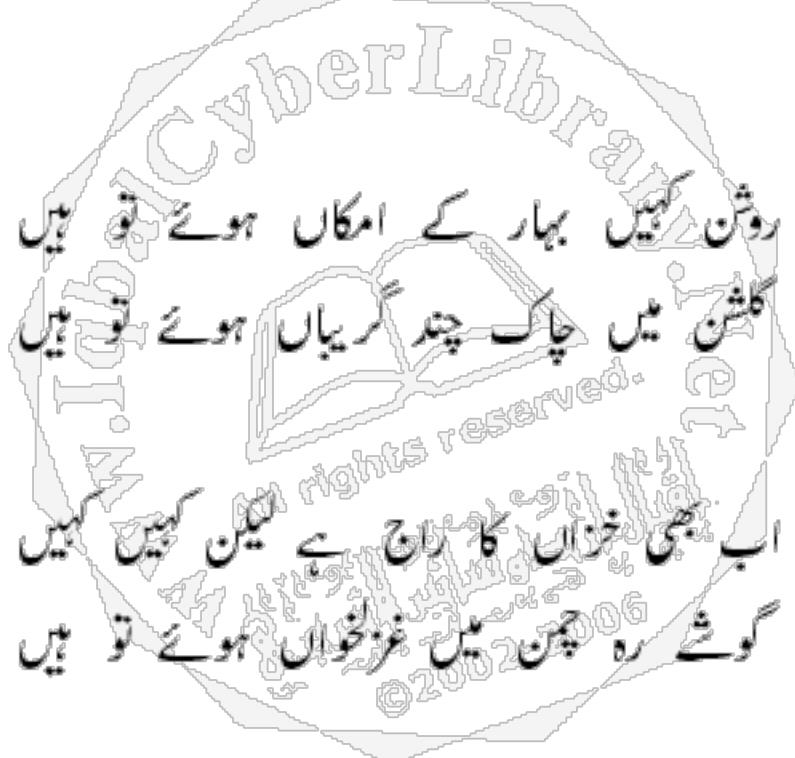
قص سے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو  
سوئے سے خانہ سپران حرم آگے ہیں

کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ  
وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں

اور کچھ دیر نہ گزرے شب فرقہ سے کہو  
دل بھی کم دکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں



اگست ۱۹۵۲ء



ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر  
کچھ کچھ سحر کے رنگ پر افشاں ہوئے تو ہیں

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل  
محفل میں کچھ چدائی فروزان ہوئے تو ہیں

ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لٹا کے ہم  
اب بے نیاز گردش دواراں ہوئے تو ہیں

اہل نفس کی صحیح چمن میں کھلے گی آنکھ  
باد صبا سے وعدہ و پیاں ہوئے تو ہیں

ہے دشت اب بھی دشت، مگر خون پا سے فیض  
سیراب چند خار مغیلائیں ہوئے تو ہیں



# شار میں تری گلیوں کے ....

شار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں  
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سراہا کے چلے  
جو کوئی چاہئے والا طوف کو نکھے  
نظر پھا کے چلے، جسم، جاں بجا کے چلے  
ہے اہل دل کے لیے اب یہ اظم بست و کشاد  
کہ سنک و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

☆ سگ ہار اسٹند و سگاں را کشاوند (شیخ سعدی)

بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لیے  
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں  
بنے ہیں اہل ہوس، مدھی بھی، منصف بھی  
کے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں  
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں  
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزن زندگی تو دل یہ سمجھا ہے  
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی

چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے  
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی

غرض تصور شام و سحر میں جیتے ہیں  
گرفت سایہ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ الحقیقی رہی ہے قلم سے خلق  
نہ ان کی رسم نہیں ہے، نہ اپنی ریت نہیں  
یونہی ہمیشہ کھلانے ہیں ہم نے آج میں پھول  
نہ ان کی ہمار نہیں ہے نہ اپنی جیت نہیں

اسی سبب سے نلک کا گله نہیں کرتے  
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بھم ہوں گے  
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں  
گر آج اونچ پہ ہے طالع رقیب تو کیا  
یہ چار دن کی خدا تو کوئی بات نہیں  
جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں  
علاج گروش لیل و نہار رکھتے ہیں



اب وہی حرف جنوں سب کے زبانِ پھری ہے  
 جو بھی چل نکلی ہے وہ باتِ کہاں پھری ہے  
 آج تک شیخ کے اکرام میں جو شبھی ہرام  
 اب وہی دشمنِ دیس، داحشِ جاں پھری ہے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریناں ناصح  
 گفتگو آج سر کوئے بتاں پھری ہے

ہے وہی عارض لیاں، وہی شیریں کا دہن  
 نگہ شوق گھری بھر کو جہاں پھری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی  
 بھر کی شب ہے تو کیا سخت گراں پھری ہے

بکھری اک بار تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شیم  
 دل سے نکلی ہے تو کب لب پہ فغاں پھری ہے

دست صیاد بھی عاجز ہے، کف ٹھجیں بھی  
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زبان ٹھہری

آتے آتے یونہی دم بھر کو رکی ہو گی بہار  
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزان ٹھہری ہے  
لہم نے جو طرز قفال کی ہے نفس میں ایجاد  
فیض گلشن میں وہی طرز بیان ٹھہرکی ہے

CyberLib  
All rights reserved.  
02-2006

# شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں



تم نا حق مکارے چن چن کر  
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو  
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں  
کیا اس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انہی مکاروں میں کہیں  
وہ ساغر دل ہے جس میں کبھی  
صد ناز سے اڑا کرتی تھی  
صہبائے غم جاناں کی پری

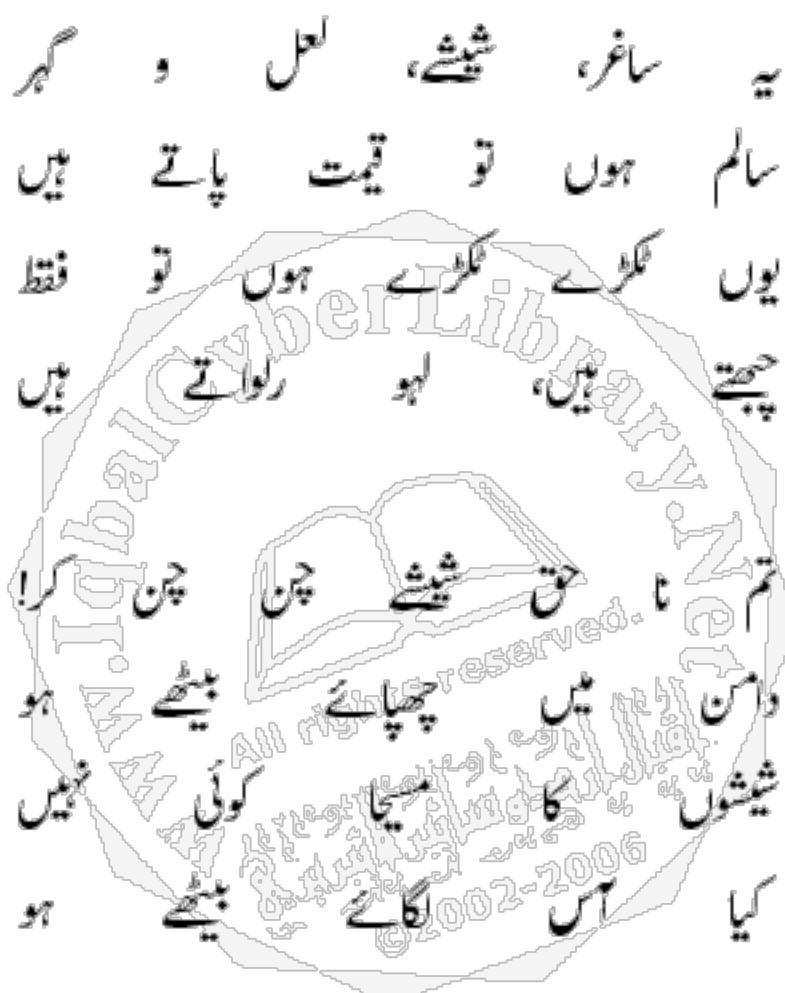
پھر دنیا والوں نے تم سے  
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا  
جو سے تھی بہا دی مٹی میں

# مہمان کا شہر توڑ دیا

یہ  
ان  
تم  
معت  
جن میں  
کو سجا یا  
All rights reserved.  
ناداری  
دفتر، ۲۰۰۶ء  
ان سپنوں  
بے رحم تھا چوکھے پتھراو  
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے  
شاید بیسیں  
کے شوخ بلو ریں پنون  
نگیں ریں  
خاتون

یا شاید ان ذروں میں کہیں  
موتی ہے تمہاری عزت کا  
وہ جس سے تمہارے عجز پہ بھی  
شمشاو قدوں نے رشک کیا

اس مال کی دھن میں پھرتے تھے  
تاجر بھی بہت، رہن بن بھی کئی  
ہے چور نگر، یاں مفلس کی  
گر جان پچی تو آن گئی



یادوں کے گریبانوں کے رو  
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے  
اک بجیہ ادھیرا، ایک سیا  
یوں عمر بمر کب ہوتی ہے؟

اس کار گہ ہستی میں جہاں  
یہ سافر، شیشے ڈھلتے ہیں  
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے  
سب دامن پر ہو سکتے ہیں

جو ہاتھ ہٹھے، یاور ہے یہاں  
جو آنکھ اٹھے، وہ بخاور

یاں دھن دولت کا انت نہیں  
ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ، مگر



کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر  
یہ پردے نوچ گراتے ہیں  
ہستی کے اٹھائی گیروں کی  
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے  
انت بستی بستی نگر نگر  
ہر لمحے گھر کے سینے میں  
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں  
جوت لگاتے پھرتے ہوہ  
آگ لگاتے پھرتے ہوہ  
آگ بھاتے رہتے ہوہ  
سب سماگر، شیشے، اعلیٰ  
اس بادل میں بوجاتے ہوں  
اٹھو سب خالی 2002-2006  
اس رن سے بلاوے آتے ہیں





All rights reserved.  
© 2002-2006

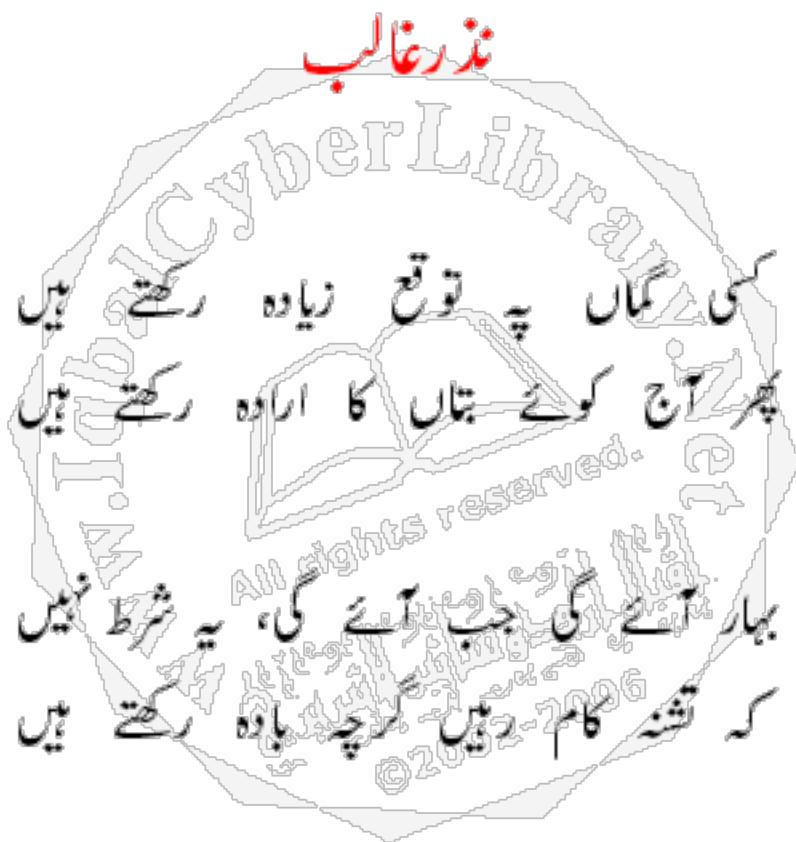
بُعدَةٍ عَذَابٌ لِلْمُنْكَرِ  
وَمُجْدَةٌ لِلْمُتَّقِينَ



عمر کے ہر ورق پہ دل کو نظر  
 تیری مہر و وفا کے باب آئے

کر رہا تھا غم جہاں کا حساب  
 آج تم یاد بے حساب آئے  
 نہ گئی تیرے غم کی سرداری  
 دل میں یوں روز انقلاب آئے  
 جل اٹھے بزم غیر کے در و بام  
 جب بھی ہم خانماں خراب آئے





تری نظر کا گلہ کیا؟ جو ہے گلہ دل کا  
تو ہم سے ہے، کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں

نہیں شراب سے رنگیں تو غرق خون ہیں کہ ہم  
خیال وضع قیص و لبادہ رکھتے ہیں

غم جہاں ہو، غم یار ہو کہ تیر ستم  
جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

جواب واعث چاکب زبان میں فیض ہمیں  
یہی بہت ہیں جو دو حرف سادہ رکھتے ہیں





صح گل ہو کہ شام مے خانے  
 مدح اس روئے نازیں کی ہے

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں  
 ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے

ذکر دوزخ، بیان حور و قصور  
 بات گویا بیہیں کہیں کی ہے

اشک تو کچھ بھی رنگ لانہ سکے  
 خون سے تراج آستین کی ہے

کیسے مانیں حرم کے سہل پسند  
رسم جو عاشقوں کے دیں کی ہے



# زندگی کی ایک شام

شام کے پیچے و ختم ستاروں کے  
زینہ اتر رہی ہے بات  
یوں صبا پاکیزے گزرتی ہے  
جیسے بہرہ دی کھنپوں نے پیار کی بات  
صحن زندگی کے بیرونی وطن اشجار  
سنگوں، محو بیس بنانے میں  
دامن آسمان پر نقش و نگار  
شانہ بام پر دملتا ہے!  
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل  
خاک میں گھل گئی ہے آب نجوم  
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل  
سائز گوشوں میں نیلاگوں سائے  
لہلہتے ہیں جس طرح دل میں  
موح درد فراق یار آئے

دل سے پیام خیال کہتا ہے  
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل  
ظلہ کا زہر گھونکے والے

کامراں ہو سکیں گے اُج نہ کل  
جلوہ گاہ وصال کی شمعیں

وہ بجھا بھی پکے اگر تو کیا؟  
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

All rights reserved.  
© 2002-2006

www.QuranUrdu.com

# زندگی کی ایک صبح

رأت باتی تھی ابھی جب سر با میں آ کر  
چاند نے مجھ سے کہا جاگ سحر آئی ہے  
جاگ اس شب جو میسے خواب ترا حصہ تھی  
جام کے بیٹے سے جام اتر آئی ہے  
عس جنائی کو وین کر کے آجھی میری نظر  
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر

جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور  
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنوں گر گر کر  
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے  
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

صحن زندگی فیں رفیقوں کے سپھرے چہرے  
صلح خلمت سے دکتے ہوئے ابھرے کم کم  
نیند کی اوں نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا  
دلیں کا درد فراق رخ محبوب کا غم

دور نوبت ہوئی، پھرنے لگے بیزار قدم

زرو فاقوں کے ستائے ہوئے پھرے والے  
اہل زندگی کے غضبناک، خروشان نالے  
جن کی باہوں میں پھرا کرتے ہیں بائیں ڈالے

لذبِ خواب سے مخمور ہوائیں جا گیں  
جیل کی زہر بھری چور صدائیں جا گیں  
دور و روازہ کھلا کوئی کوئی بند ہوا  
دور پھپٹ کوئی رنجیہ، محل کے روئی  
دور اتراء کی ٹالے کے جگہ میں نجھر

سر پکنے لگا رہ کے دریچہ کوئی  
گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمن جاں  
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنات گرائ  
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کنائ  
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں  
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر  
جس کے ترکش میں ہے امید کے جلتے ہوئے تیر  
(ناتمام)



بیو

دشت تہائی میں، اے جان جہاں، لرناں ہیں  
تیری آواز کے سامنے، تڑے ہونٹوں کے سراب  
دشت تہائی میں، توتے پھلو کے سمن اور گلاب  
اٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ  
اپنی خوبیوں میں سلکتی ہوئی مدھم مدھم  
دور افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ  
گر رہی ہے تری دلمدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے، اسے جان جہاں، رکھا ہے  
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یار نے ہات  
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صحیح فراق  
ڈھل گیا بھر کا دن، ابھی گئی وصل کی رات





ناموسِ جان و دل کی بازی گئی تھی ورنہ  
آسان نہ تھی کچھ ایسی راہ وفا شعاراں

مجرم ہو خواہ کوئی، رہتا ہے ناصحون کا  
 روئے خن ہمیشہ سوئے جگر فکاراں

ہے اب بھی وقت زاہد، ترمیم زہد کر لے  
 سوئے حرم چلا ہے انبوہ بادہ خواراں

شامک قریب پہنچی صح وصال ہدم  
 موجِ صبا لیے ہے خوبیوئے خوش کناراں

ہے اپنی کشت ویراں، سر بذر اس یقین سے  
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابرو باراں





اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی  
قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم

دیکھیں ہے کون کون، ضرورت نہیں رہی  
کوئے ستم میں سب کو خفا کر چکے ہیں ہم

اب اپنا اختیار ہے چاہیں جہاں چلیں  
رہبر سے اپنی راہ جدا کر چکے ہیں ہم

ان کی نظر میں، کیا کریں، پھیکا ہے اب بھی رنگ  
جنما لہو تھا صرف قبا کر چکے ہیں ہم

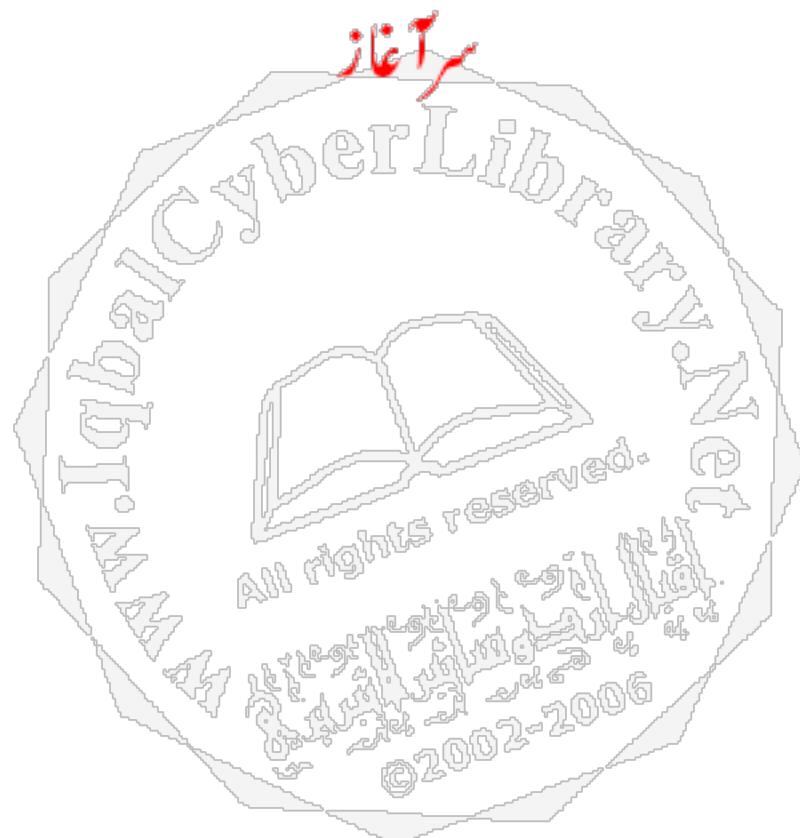
کچھ اپنے دل کی خو کا بھی شکرانہ چاہے  
سو بار ان کی خو کا گلا کر پکھے ہیں ہم



میخانے کی روتق ہیں، کبھی خانہوں کی  
اپنا لی ہوں والوں نے جو کرم چلی ہے  
ولداری واعظ کو All rights reserved. ہمیں باقی ہیں ورنہ  
اب شہر میں ہر مردم خرابات ملی ہے

© 2002-2006





مقدمہ سازش راولپنڈی کے دنوں میں فیض کے ساتھ میں بھی سنگل جیل (جیدر آباد سنڈھ) میں تھا۔ 2 نومبر 1956ء تک ہمارے مقدمے کی سماut ختم ہو چکی تھی۔ ہمیں روز روza ایشل ٹریبون کے اجلاس میں جا کر ملزموں کے کٹھرے میں گھنٹوں بیٹھے رہنے اور اسی دوران میں اہوں کی شہادتوں، وکیلوں کی جرح اور بحث اور معزز جگوں کی فاضلانہ قانونی مشکلیوں سے نجات مل گئی تھی۔ ابھی فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا اور ہما مید و نیم کے عالم میں تھے چھٹی و افر تھی انہیں دنوں ایک دن یہ اطلاع ملی کہ دست صبا شائع ہو گئی۔ گوہم اس کی تمام چیزیں فیض کے منہ سے سن چکے تھے، اور انہیں بار بار پڑھ چکے تھے، لیکن اس خبر سے ہم میں سے تمام قیدیوں کو جو ادب سے مس رکھتے تھے ایک غیر معمولی مسرت ہوئی۔ جیل کے حکام سے اجازت لے کر ہم نے ایک پارٹی بھی کرڈی جس میں ہم قیدیوں نے مل کر فیض کو دست صبا کی اشاعت پر مبارکبادی۔ اس موقع پر مجملہ اور باتوں کے میں نے یہ کہا تھا کہ بہت عرصہ گزر جانے کے بعد جب لوگ راولپنڈی سازش کے مقدمے کو بھول جائیں گے اور پاکستان کا مورخ 1952ء کے اہم واقعات پر نظر ڈالے گا تو غالباً اس سال کا سب سے اہم تاریخی واقعہ نظموں کی اس چھوٹی سی کتاب کی اشاعت کو ہی قرار دیا جائے گا۔

بہت دنوں سے لوگ جن میں بعض نیک اندیش اور بعض بد اندیش ہیں، اردو ادب اور خاص طور پر اس کی ترقی پسند صنف پر جمود طاری ہونے یا اس کے انحطاط کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں اس نقطہ نظر کو صحیح نہیں سمجھتا۔ بلکہ میر اخیال ہے کہ اردو ادب

کا جدید دور اس کے روشن ترین ادوار میں سے ہے۔ یہ دور آقریباً 1930ء سے شروع ہوتا ہے ابھی تک جاری ہے اور اگر ہم گزٹہ چار پان سال کو ہی لے لیں تو میرے خیال میں فیض کی دست صبا اور زندگی نامہ ندیم قاسمی کی شعلہ گل سردار جعفری کی پتھر کی دیوار احتشام حسین کی تنقید اور عملی تنقید اور محنوں گور کھپوری کی نقوش و افکار (ختمہ دیگر کتابوں کے) اس عویٰ میں کافی ہیں کہ خلیق کا سرخ شعلہ

”جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، تو انہی بھی“

نامساعد حالات میں نہ ہیما ہوتا ہے اور نہ بھٹا ہے بلکہ جہل و رجعت کی کالی آندھیا سے اور بھی بھڑکاتی ہیں اور اس طرح مجاہدہ اور تصادم کے طوفانوں سے گزر کر اور اس پیکار سے قوت و حرارت حاصل کر کے حق و صداقت کا نور پہلے سے بھی زیادہ درخشان ہو جاتا ہے اور اس کے حسن اور تاثر میں صدر گنگ نئی تابندگیاں جھملانے لگتی ہیں۔

زندگی نامہ کی پیشہ منظومات فیض نے منظمگری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں یعنی جولائی 1953ء سے مارچ 1955ء تک کی لکھی ہوئی چیزیں اس میں ہیں۔ اس درمیان میں ہم ایک دوسرے سے پھر گئے تھے کیونکہ ہم دونوں کو چار چار سال قید با مشقت کی سزا دیئے کے بعد اہل اقتدار نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ایک ساتھ جیل میں نہ رکھے جائیں۔ فیض کو پنجاب میں منظمگری جیل کو بھیجا گیا اور مجھے حیدر آباد سندھ سے بلوچستان کے سنٹرل جیل مچھ کو ہم ایک دوسرے سے خط و کتاب بھی نہ کر سکتے تھے تاہم دوسرے دوستوں کے خطوں اور بعض اردو رسالوں کے ذریعے مجھے فیض کی چند غزلیں اور ترجمیں جو اس زمانے میں لکھی گئیں، پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

اب کے حالات زندگی میرے لیے کافی خوشگوار ہیں اور میں آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہوں، اس کے باوجود جب میں ان ذہنی، جذبات اور روحانی کیفیات کا

خیال کرتا ہوں، جو مجھ پر اس وقت طاری ہوتی تھیں جب اپنے اس محبوب ترین دوست اور ہدم کا کلام پڑھتا تھا تو اس کا اظہار مشکل معلوم ہوتا تھا شاید بے لگ تقید کے لیے یہ بھی اچھا نہیں ہے کہ چونکہ ہمارے بہت سے تجربے، زندگی اور اپنے وطن کو شربیا رہا اور حسین بنانے کے متعلق ہمارے خواب، ہمارا درود، ہماری نظریں اور فہمیں مشترک تھیں اس لیے فیض کے ان اشعار سے غیر معمولی طور پر متأثر ہوتا تھا۔ اگر میرا اول بھی خون کے آنسو رہتا تھا کہ قید و بند کے مصائب اور صعوبتیں اس کا حصہ کیوں ہیں جو اپنی حسن کا دنی سے سب کی زندگی کو اتنی فیاضی سے مرضع کر دیتا ہے، اور اپنی نسبتی سے ہم سب کی رگوں میں سرورگی نہریں بہادیتا ہے تو کبھی میرا ذہن اس کی تخلیل کی آن شکران اور فرحاں گل کاریوں سے کب شعور کرتا جہاں جدید جدلیاتی علم کی ضیا پاشیاں، انسانیت کے شریف ترین جذبات سے اس طرح حل گئی ہیں جیسے شعرا مہر سے تمہازت۔

فیض کی ان نظموں کو مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ان اقدار کا تعلق ہے، جن کو شاعر نے ان میں پیش کیا ہے، وہ تو وہی ہیں، جو اس زمانے میں تمام ترقی پسند انسانیت کی اقدار ہیں، لیکن فیض نے ان کو اتنی خوبی سے اپنایا ہے کہ وہ نہ تو ہماری تہذیب و تمدن کی بہترین روایات سے الگ نظر آتی ہیں اور نہ شاعر کی انفرادیت، اس کا نرم، شیریں اور مترنم انداز کلام کہیں بھی ان سے جدا ہوتا ہے۔ اس کے متحرک اور رواں استعاروں میں ہمارے وطن کے پھولوں کی خوبیوں ہے، اس کے خیالات میں ان سچائیوں اور ان جمہوری مقاصد کی چمک ہے جن سے ہماری قوم کی عظیم اکثریت کے دل روشن ہیں۔ اگر تہذیبی ارتقاء کا مطلب یہ ہے کہ انسان مادی اور روحانی عسرت سے نجات حاصل کر کے اپنے دلوں میں گداز، اپنی بصیرت میں حق شناسی اور اپنے کردار اور استقامت و رفتہ پیدا کریں اور ہماری زندگی مجموعی اور انفرادی حیثیت سے بیرونی اور اندر وہی طور پر مصفا بھی

ہوا اور معطر بھی تو فیض کا شعر غالباً ان تمام تہذیبی مقاص کو چھو لینے کی کوشش کرتا ہے۔  
میرا خیال ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں اس کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب یہی  
ہے البتہ فیض کے تمام چاہتے والے نقش فریادی دست صبا اور زندگی نامہ کے شیدا  
ہونے کے باوجود ان سے یہ موقع اور امید رکھتے ہیں کلکمیت اور کیفیت دونوں لحاظ  
سے ان کی وہ تخلیقیں جو ابھی نہیں ہوئیں، ان کے مقابلے میں جو کہ وہ کر چکے ہیں  
زیادہ گراں قدر ہوں گی۔

للسنو، 13 جنوری 1956ء

سجاد نیمی  
© 2002-2006

رودار قفس



فیض صاحب کی کسی تصنیف کا دیباچہ لکھنے کی سعادت ایک خزانہ پانے سے کم کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی دلتوں کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب لکھنے بیٹھا۔ کہتے ہیں پانے زمانے کے راجے مہاراجے جب کسی رگشہ بخت سفید پوش کی پریشان حالیوں میں اضافہ کرنا چاہتے تھے تو اسے ایک عدو ہاتھی بخش دیا کرتے تھے معاملہ یعنیہ ایسا تو نہیں ہے، لیکن ایک سید ہے سادے فوجی آدمی کے لیے فیض کے کلام کے بارے میں کچھ لکھنا کافی پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے اور پھر ایک کسان اور خاص کرنو آبادیاتی ملک کے کسان کے بیٹھے کی تربیت ہی کیا ہوتی ہے! دیہاتی سکولوں کی تعلیم اور وہ بھی تو ہم پرستی اور جہالت کے گھناؤ نے سایوں تسلی، ایسے ماحول میں جس میں غربت و ناداری کے طفیل پڑھنے لکھنے کی نسبت ہل کی لکیر سیدھی رکھنا، ڈھونڈنگر کی نگہبانی کرنا اور بیلوں کے لیے چارہ لانا زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، جہاں ہرٹی شے اور ہر نئے خیال کا تھارت آمیز تمسخر اڑا یا جاتا ہے، جہاں دنیا کا بلند ترین خیال اور پاکیزہ ترین جذبہ دو بیگم زمین کے پیانے سے ناپا جاتا ہے۔ میرا قلمی پس منظر ایسا ہی تھا۔ فون لطیفہ میرے اسامدہ کے بس کی بات نہیں تھے، میرا ان سے مس کیا ہوتا۔ کتابیں زندگی کا حصہ نہیں تھیں، صرف امتحان پاس

کرنے کا ذریعہ تھیں۔ لا جبری یاں، علماء کی مختلیں، علمی مباحثے، مشاعرے، ڈرامے، موسیقی، رقص آرٹ گیلریاں، میوزیم سب مفقود اور چاروں طرف سامراجیوں اور ان کے ملکی ایجنسیوں کے اقتضادی بوجھتے کراہتی ہوئی مخلوق! ایسی روکھی پھیکی تعلیم کے بعد آٹھویں سال کی فوج کی صاحب بہادری نے رہی کسی کسر کاں دی وہاں کا تو باوا آدمی نہ لاتھا اور کالا لوگ کی دوسری زبانوں کا پہنچ دیں میں دلیں نکالا ملا جو اتحادیاں کی حیثیت انگریزی زبان کی لوئڈ یوں باند یوں کی سی تھی جیل کے چار سال اس لحاظ سے مفید ہے کہ یکسوئی سے مطالعہ کا موقع مل گیا۔ سونے پہ سہارا گیا جو اکیل پروفسر بھی ساتھ ہی قابو گئے تھے۔

زندگی نامہ کا دیباچہ لکھنے کے بھانے میں اپنی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی مشاہدے کی صحیح جانشی اسی وقت ہو سکتی ہے جب شاہد کے مقام اور اس کی صلاحیتوں کا پورا پورا تعین کر لیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں کچھ مہینے کم چار سال دن رات فیض کے ساتھ رہا ہوں۔ یہ طویل عرصہ ہم نے جیل کے ایک ہی اھانے میں ماحقة کوٹھریوں میں گزارا ہے، سینکڑوں مرتبہ صح سویرے سب سے پہلے ایک دوسرے کے منہ لگے ہیں، اپنی خوشیاں اور غم باہم بانٹنے پر مجبور رہے۔ جیل کے باہر آدمی سینکڑوں لوگوں کو متاثر ہے ملتانہ بھی ہوتا دیکھ ضرور لیتا ہے۔ کئی نسم کی آوازیں سنتا ہے، بیسیوں مناظر سے واسطہ پڑتا ہے۔ کسی سے نفرت ہے تو کتنی کترات کے نکل سکتا ہے، کسی سے محبت ہے تو ملاقات کی راہیں ڈھونڈ لیتا ہے یا ان کی تلاش میں جی بھلا لیتا ہے۔ جیل میں آدمی کی مرضی اس سے چھین لی جاتی ہے اور اس کی نقل و حرکت محدود کر دی جاتی ہے۔ وہاں کی کائنات دو چار قیدی، دو چار پہرے دار، کچھ کوٹھریاں اور کچھ دیواریں، ایک آدھ درخت، ایک دو گلہریاں نصف درجن کے قریب چھپکیاں اور کچھ کوئے اور دوسرے پرندے ہوتے ہیں، جن میں مہینوں بلکہ سالوں تک تبدیلی نہیں آتی۔ مجھے اس چھوٹی سی دنیا

میں فیض صاحب کے ساتھ مسلسل چار سال تک رہنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن اس طویل قرب کے باوجود ضروری نہیں ہے کہ میں اپنے موضوع سے پورا انصاف کر سکوں۔ ایک اندھا کائنات کی زندگی میں عمر گز ارکر بھی رنگوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ کئی لوگ اچھی بھلی نظر رکھتے ہوئے بھی بعض رنگوں کو نہیں پہچان سکتے۔ ریڈ یا پروگرام سننے کے لیے طاقتور ریڈ یا شیشن ہی نہیں رسیونگ یاٹ بھی نقائص سے پاک ہونا چاہیے۔

یہاں پر زندگی کی نظموں اور غزلوں پر تقدیر و تبرہ اگر چمیر انتصود نہیں پھر بھی شاعر کے بیان میں ان کا ذکر نہ ہزیر ہے فیض کی اطاعت کا بیان میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اڑکھنوئی کی زبان میں فیض احمد فیض کی شاعری ترقی کے مدارج طے کر کے اب اس نقطہ عروج پر ہے جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی ہوئی ہو۔ تخیل نے صناعت کے جو ہر دکھائے ہیں اور معصوم جذبات کو حسین پیکر بخشا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریوں کا ایک غول، ایک ظالمی فضا میں اس طرح مست پرواز ہے کہ ایک پر ایک کی چھوٹ پڑ رہی ہے اور قوس قزح کے عکاس بادلوں سے ست رنگی بارش ہو رہی ہے، ہر کوئی بقدر ظرف اس اطاعت سے بہرہ اندوڑ ہو سکتا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے فہم کے مطابق، چیدہ چیدہ نظموں کا پس منظر بیان کر دوں۔ اتنا خیال رہے کہ صحیح ادب اپنے پس منظر کی حدود و قیود کو توڑ کر بہت آگے نکل جاتا ہے۔ فیض کی شاعری کو اس کے پس منظر کے سانچے میں محدود کر کے دیکھنا ظلم ہے۔ اس لیے میری کاوشوں کو ایک سائنس بورڈ سے زیادہ حیثیت نہیں دینی چاہیے۔ آگے راستہ سب کا اپنا اپنا ہے اور اپنی اپنی ہمت۔

فیض صاحب 9 مارچ 1951ء کو قید ہوئے اور اپریل 1955ء میں رہا ہوئے۔ اس طرح ان کی اسیری کے دن کچھ اور چار سال بنتے ہیں۔ اس عرصہ میں وہ پہلے تین مہینے سرگودھا اور لاکل پور کے جیلوں میں قید تھا۔ میں رہے۔ اس کے

بعد جولائی 1953ء تک حیدر آباد (سنده) جیل میں راولپنڈی سازش کیس کے باقی اسیروں کے ساتھ رہے۔ جولائی 1953ء میں ہم سب کو چھوٹی چھوٹی لگلیوں میں بانٹ کر لا ہو، نگمری، مچھ (بلوچستان) اور حیدر آباد کے جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ فیض صاحب کے لیے میرے اور کچھ خضریات کے ہمراہ منگری سنٹرل جیل کا انتخاب کیا گیا۔ لیکن وہ چونکہ بغرض علاج کراچی چلے گئے تھے، اس لیے کہیں 1953ء میں جا کر ہمارے پاس نگمری پہنچے۔ یہاں سے ہم اکٹھے رہا ہوئے۔

مجھے فیض صاحب کی گرفتاری کے کوئی تین ماہ بعد 1951ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس لیے خلق خدا کی سرگوشیاں متاثر ہیں، فیض صاحب کے ساتھ اس دوران میں ان کے عزیزوں دوستوں کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ نہی وہ کسی سے خط و کتابت کر سکتے تھے۔ ان کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور قید میں ان کے ساتھ سلوک کے بارے میں عجیب عجیب لخراش قصہ مشہور تھے۔ جب پھیلی باران سے حیدر آباد جیل میں ملاقات ہوئی تو بارے اطمینان ہوا۔ وہی خندہ پیشانی، وہی چمکتی ہوئی آنکھیں، وہی گوئی مسکراہٹ جس کا نور سب طرف پھیل رہا تھا، اور پھر وہ فاتح عالم محبت، جس سے ان کے جاننے والے مانوس ہیں۔

جیل ایک طرح کا طلسماتی آئینہ خانہ ہوتا ہے جہاں صورتوں کے نہیں سیرتوں کے عکس عجیب و غریب شکلیں بنا کر ظاہر ہوتے ہیں۔ کسی کی طبع جھگڑے کی طرف مائل ہے تو وہ ہر کسی سے لڑائی مول یعنی کی فکر میں ہو گا۔ کوئی بزدل طبیعت کا ہے تو وہ گور کے کیڑے کی طرح ہر وقت سرچھانے کی دھن میں ہو گا۔ کسی کی مزاج میں قنوطیت ہے تو وہ ہر اچھی بُری خبر سے اپنی دل شکنی کے اسباب ڈھونڈ لائے گا۔ کسی کو کوئی خط ہے تو وہ دیوانگی کی حد تک ترقی کر جائے گا۔ طبیعتوں میں کمینگی اور شگ نظری خاص طور پر پھیلتی پھوٹی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے ساتھیوں اور جیل

والوں سے جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے انسان کی ساری کائنات جیل کی چار دیواری میں محدود کردی جاتی ہے اور اس کے فکر و نظر میں تنگی آ جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانوں پر حیوانی بندشیں عاید کردی جاتی ہیں۔ کوٹھڑی میں بند کرنا، ایک احاطے میں محصور کر دینا، بیڑیوں کا استعمال، عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات پر پابندیاں، بے بسی کا عالم، یہ سب چیزیں اسیروں کے دل پر نوک سوزن کا کام کرتی ہیں۔ جیل کے بعض افسر بھی قیدیوں کی دل تلنگنی کے موقع ڈھونڈتے ہیں اور قیدی کی عزت نفس اور وقار کو ٹھیک پہنچانے میں خاصے ماہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات سب کے بارے میں حق ہیں۔

ان حالات میں ایک آدمی قید ہو کر اگر اپنی روزمرہ کی شخصیت قائم نہ رکھ سکتا تو کوئی حرمت کی بات نہیں۔ کمال ان لوگوں کا ہے جو جیل جا کر بھی وضع داری قائم رکھ سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو میں جیل جانے سے پہلے جانتا تھا ان میں فیض صاحب ہی ایسے تھے جو بظاہر اس سے مس نہ ہوئے۔ لیکن عام لوگوں کی طرح طبیعتوں کا بوجھ کم کرنے کے لیے لڑائی جھگڑے، دنگہ فساد اور اسی قسم کے دوسرے سیفٹی ویلو (Safety Valve) استعمال نہ کرنے سے فیض صاحب پر جو ڈنی اور جسمانی فشار پڑا وہ ان کے دوستوں سے مخفی نہیں۔ شاعری غیمت تھی، جس کے ذریعے دل کا غبار نکال لیا کرتے تھے۔ لیکن شاعری بذات خود دل و جگر کے ایندھن پر جلا پاتی ہے۔

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجران  
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے!

حیدر آباد میں دوران مقدمہ کے دن بھی عجیب دن تھے۔ تین ہفتے کے ٹوڈی قسم کے لوگ اخباروں، اشتہاروں، جلسوں، جلوسوں میں ہمیں گولی کا نشانہ بنانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بعض اخباروں نے غدار نمبر نکال دیے تھے۔ کچھ اس قسم کا

ماہول پیدا کر دیا گیا کہ ملک میں ہر مرد آزاد یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کو بھی سازش میں دھر لیا جائے گا۔ چاروں طرف ایک دہشت اور سراسیمگلی کی فضائی اور ہمارے رشتہ دار اور دوست ہماری جانب سے یا تھوڑا بیٹھے تھے۔ لیکن جیل کے اندر ہماری اپنی یہ حالت تھی کہ گویا کسی پینگ پام نے ہوئے ہیں۔ سب طرف ہنسی نداق تھا، قہقہے تھے، امید تھی، حوصلہ تھا۔ تو الیاں ہوتی تھیں سوانگ بھرے جاتے تھے! اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہمیں اپنی بیت پر بھرو ساتھا اور دوسرا شاید یہ ہو سکتی ہے کہ بہت بڑے خطرے کے ساتھ آدمی عموماً دوسری براستے اختیار کرتا ہے یا تو اٹھے پاؤں بھاگ اٹھتا ہے یا مقابلے کی ٹھان لیتا ہے۔ موخر الذکر کی بھی آنگے دو صورتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم میں بعض ایسے بھی ہوں گے جو مصائب کی ہونا کیوں کے رو بروز لرز کرنے والے ہے اور کچھایے بھی تھے کہ

عشرت قتل گہ اہل تنہ مت پوچھا  
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

یہ صورت حال حیدر آباد سے مخصوص نہیں تھی، لاہور کے چند روز کے قیام میں بھی ہماری یہی حالت رہی تھی چنانچہ لاہور کے برڈ ووڈیرس (Bird Wood) (Barracks) میں پولیس کی تحویل میں دیے جانے کے کوئی پانچ منٹ بعد منی 1951ء میں گرفتار ہونے والے ساتوں فوجی افسروں، ظفر اللہ پوشنی کی قیادت میں فضول قسم کے فوجی کورس (Chorus) (الاپ رہے تھے (اس قسم کے بے ضرر لغویات کی چھوٹے فوجی افسروں کو خاص موقعوں پر اجازت ہوتی ہے) لاہور جیل کا ایک واقعہ یاد کرتا ہوں تو اب بھی نہیں آ جاتی ہے وہاں ہمیں بم کیس وارڈ (Bomb Case Ward) میں رکھا گیا (یہ وارڈ بہت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے لیے خاص طور پر تعمیر کیا گیا تھا) اس کے صحن میں ایک بارہ دری سی ہے، جس کے دروازوں میں لوہے کی مضبوط جالی لگی ہوئی ہے۔ رات کو ہم یہیں سویا کرتے تھے۔

ایک دن سونے کی تیاری میں تھے کہ ایک بوڑھا ستری جالی سے لگ کر اندر رجھانے لگا۔ خضریات نے پوچھا، بابا تمہیں ہم قید میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے کہا جی ہاں جنا بخضریات بول لیکن بابا تو تم قید میں نظر آتے ہواں پر بوڑھا ستری پہلے تو بوکھلا سا گیا۔ پھر اس زور سے ہٹنے لگا کہ ہم بھی ہٹتے ہٹتے لوٹ پوٹ ہو گئے ایک نشر تھا جس میں بہب مکن تھے۔

جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں  
علام گروش میں ٹھوڑا نیمار رکھتے ہیں

لاہوری کا ایک لطیفہ یاد ہے جیسا کہ ایک دن ہمیں ریمانڈ کے لیے عدالت میں لے جایا جانا تھا۔ اطلاع ملی کہ سید سجاد ظہیر بھی ساتھ ہے جائیں گے۔ جیل کے بڑے دروازے کے اندر پولیس کی قیدی ڈھونڈنے والی گاڑی کھڑی تھی۔ ہم وہاں رک گئے اور سید صاحب کا انتظار کرنے لگے اتنے میں پھانسی کی کوٹھیوں کی طرف سے سفید شلوار کرتے میں ملبوس، سر پر جناح کیپ جمائے، ایک بھاری بھر کم، زندگی سے مطمئن شخص آتا دکھائی دیا۔ ہمارے درمیان چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ کیا یہ سجاد ظہیر ہو سکتا ہے۔ ہم میں سے ان کے ساتھ کسی کی بھی جان پچان نہیں تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کیونکہ نہایت فتح صورت، درندہ سیرت انسان ہوتے ہیں۔ وہنے باہمیں پستول لگاتے ہیں۔ پہیٹ پر پیش قبض باندھتے ہیں۔ بڑی بڑی موچھیں اور خونخوار آنکھیں رکھتے ہیں اور ان کا موضوع غنیمت قتل و غارت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سجاد ظہیر چونکہ پاکستان کیونکہ پارٹی کے جزل سیکرٹری تھے، اس لیے ان لوگوں کے خیال میں ان کے منہ سے ہر سانس میں آگ نکلنی چاہیے تھی اور ان کو اس قسم کا کاہیاں انسان ہونا چاہیے تھا کہ ڈبکی لگائے تو جیل سے باہر چلا جائے۔ یہ شخص جو نرم چال، پا کیزہ خدوحال اور ایک عدد عالمان تو نہ لیے ہوئے تھا سجاد ظہیر کیسے ہو سکتا تھا۔ ہمارے یہ ساتھی اپنی رائے پر اس شدت سے مصروف تھے گویا یہ ان کا جزو ایمان

ہے۔ چنانچہ چاروں ناچار ہم سب نے تسلیم کر لیا کہ یہ سجاد ظہیر نہیں ہو سکتے، کشمیری بازار کے شیخ ہوں گے یا پولیس کے کوئی خضر صورت ایجنت، چنانچہ عدالت تک تمام سفر میں ہم گم سم بیٹھے ان کی طرف نکلیں گے دیکھتے رہے۔ عدالت میں جب وہ کھڑے ہو کر گر جے کہ جناب والا پندرہ دن ہو گئے ہیں اور مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا کہ میں کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہوں یہ بالکل انغو (Preposterous) بات ہے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ سجاد ظہیر ہیں۔ ریمانڈ کے لیے ہمیں بح صاحب کی کوٹھی میں لے جایا گیا تھا۔ وہاں پولیس گارڈوں اور گاڑیوں کی اتنی کہاگہی تھی کہ کوٹھی کی اوپر کی منزل میں بہت سے لوگ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ضیاء الدین نے اشارے سے مجھے بلا کارہا بھی ایسے بیٹھے ہو جیسے مویشی چرانے آئے ہو۔ سید ہے ہو کر بیٹھو۔ کارٹھیک کرو۔ ذرا ذرا مسکراوہ دیکھتے نہیں ہو، پلک دیکھ رہی ہے اور خود بھی تن کرایے بیٹھ گیا کہ گویا تصویر اتروانے آیا ہو۔ ایئر کماؤڈور جنجوں سے میری پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ انہوں نے مصافی کرتے ہوئے میرے ہاتھ کو اس پھرتی سے نپوڑا کا ب تک یاد ہے۔

حیدر آباد کی عدالت کی عمارت جیل کے اندر تھی۔ عدالت کا وقت آٹھ ہے بارہ بجے تک ہوتا تھا۔ ہفتہ اور اتوار کے دن خالی ہوتے تھے۔ شام کے وقت کبھی کبھی ہمارے وکلاء مشورے کے لیے آ جائی کرتے تھے۔ باقی وقت ہمارا اپنا ہوتا تھا ایک ہی احاطے میں سب کے لیے جگہ نہیں تھی۔ اس لیے فیض صاحب، محمد حسین عطا، جزل اکبر خان، بریگیڈ یئر صادق خان، کرٹل ضیاء الدین، کرٹل نیاز محمد ارباب، میجر حسن خان، کیپٹن ظفر اللہ پوشنی، کیپٹن خضر حیات اور میں ایک احاطے میں رکھے گئے اور سید سجاد ظہیر، جزل مذیر احمد ایئر کماؤڈور جنجوں اور بریگیڈ یئر لطیف خان کو ایک دوسرا احاطہ دیا گیا۔ بیگم اکبر خان کے لیے علیحدہ انتظام تھا۔ کھانے کا بندوبست ہماری طرف تھا۔ ہمیں ظہور احمد اور عادل خان وو قیدی نہایت اچھا پکانے والے ملے

ہوئے تھے اور کھانے کا انظام ایک باقاعدہ آفیسرز میس (Officers Mess) کی طرز پر تھا۔ جس کا سیکرٹری گاہ ہے گا ہے چنانجا تا تھا۔ شام کے وقت والی بال اور بید منٹن بھی ہمارے احاطے میں ہی کھلیے جاتے تھے۔ چنانچہ مشترکہ سرگرمیوں کا مرکز یہی احاطہ تھا۔ مشاعرے، قوالیاں، ڈرامے عموماً یہیں ہوتے تھے۔ سید سجاد ظہیر والے احاطے میں ہم چھٹی کے دن کی صبح کو جایا کرتے تھے جہاں کافی اول سکٹ سے تو واضح ہوتی تھی اور اولیٰ اور سیاسی گفتگوؤں میں ہوتی تھیں۔

مرزا سودا کے غنچے کی طرح فیض صاحب کی بیاض برداری کا کام میرے پرورد تھا۔ جب وہ مجلس مشاعرہ کی طرف یا سجاد ظہیر کے پاں جاتے تو میں نوٹ بک اٹھائے پیچھے پیچھے ہوتا۔ دوسرے راستے جب ہمیں اس طرح جاؤں میں چلتا دیکھتے تھے چاروں طرف خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ اس لیے کہ جیل میں فیض صاحب کے نازہ کلام کا اور دسمود جشن سے کم نہیں ہوتا تھا اور پھر جس ادا سے ہم چلتے تھے، وہ بھی خوش طبعی کی ایک اچھی خاصی مزاجیہ صورت ہوتی تھی۔ فیض صاحب خراماں خراماں مسکراتے ہوئے، گہراۓ ہوئے، ہش ماۓ سے چلتے تھے اور میں ایک لٹھ بند جاث کی طرح گردن اکڑائے، تاک آسمان کی طرف اٹھائے لوگوں کے سروں کے اوپر سے دیکھتا ہوا چلتا تھا اور جب تک فیض صاحب کے تشریف رکھنے پر نہایت مودب لیکن باوقار انداز میں بیاض ان کی خدمت میں پیش نہیں کر لیتا تھا، میاں غنچہ اور مجھ میں اتنا فرق ضرور تھا کہ مرزا سودا جب کسی پنا راض ہوا کرتے تھے تو غنچہ کو صرف قلم داں آگے بڑھانا ہوتا تھا۔ باقی مرزا خود بھلتا یا کرتے تھے۔ یہاں یہ صورت تھی کہ فیض صاحب تو ہمیشہ سے باڈشمیں مروت با دوستاں مدارا کے قائل رہے ہیں اور رو برو کسی سے ناراض ہوتے ہی نہیں اور غنچہ ثانی ان دونوں دوست دشمن سب کی سرکوبی کو ہر وقت مستعد رہتے تھے۔

حیدر آباد میں فیض صاحب، میں اور عطا ملحق کمروں میں رہتے تھے۔ میں اور

عطائیان کے سب موذوں سے واقف ہو گئے تھے۔ شعر کا عالم طاری ہوتا تھا تو فیض صاحب خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ البتہ اٹھتے بیٹھتے گنگنا چکنے کے بعد اوہرا دھر دیکھنے لگتے۔ ہم بھانپ لیتے تھے کہ سامعین کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہم دونوں کئی کافرنسوں اور لگاتار سرگوشیوں کے بعد موج کی مناسبت کا اندازہ لگا کر، گورونا نک دیوی جی کے بھائی بالا اور مردانہ کی طرح حضور شاعر پہنچ جاتے تھے اور اوہرا دھر کی ہائکنے کے بعد غزل یا نظم کا مطالبہ شروع کر دیا کرتے تھے کہاں بہت عرصہ ہو گیا اور لوگ کہیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اگر نظم یا غزل تیار ہوئی تو ایک آدھ شعر سنادیا کرتے تھے ورنہ حکم ہوتا کہ بھاگ جاؤ۔ ہم مجھے جاتے تھے کہ اس الکار میں اقتراخ ہنگی ہے اور بات پھیلاؤ جاتی تھی کہ

### معنی کی سرزیں پہ نزول سروش ہے

ان کے نواح میں شورو غوفا، دنگا فساو، لڑائی جھگڑا، حتی الامکان بند کر دیا جاتا تھا۔ فیض صاحب نے بہت نازک طبع پائی ہے۔ ہمسائے میں تو تو میں میں ہو رہی ہو، دوستوں میں تلخ کلامی ہو، یا یونہی کسی نے تیوری چڑھا رکھی ہو، ان کی طبیعت ضرور خراب ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی شاعری کی کیفیت کافور ہو جاتی ہے۔ جو لوگ عطا اور مجھے جانتے ہیں وہ زیر لب مسکرار ہے ہوں گے کہ یہ حضرات جن کو شاعری دیکھ پائے تو نظر میں منہ چھپائے۔ فیض صاحب کی طبیعت پر کیونکر بار نہیں ہو جاتے تھے! اس کا بھید فیض صاحب ہی کھول سکتے ہیں۔

حیدر آباد میں قریباً ہر پندرہ ہواڑے ایک مجلس مشاعرہ منعقد کرنے کا رواج ہو گیا تھا۔ یہ مشاعرہ کبھی طرحی ہوتا تھا کبھی غیر طرحی اور کبھی کو اس میں حصہ لینا پڑتا تھا۔

دست صبا میں مندرجہ ذیل مصروعوں پر کہی ہوئی غزلیں موجود ہیں

1 ذکر مرغان گرفتار کروں یا نہ کروں

2 آج کیوں مشہور ہے ہر ایک دیوانے کا نام

3 دیکھنا وہ نگہنا زکھاں تھہری ہے

4 وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

فیض کی غزل وہ ہیں ہے دل کے قرائیں تمام کہتے ہیں حسرت موہانی کی ایک  
غزل پر کہی گئی ہے۔

میرے ذہن میں فیض صاحب کی جیل کی شاعری کے چالا رنگ ہیں (یا موڈ کہہ  
لبھے) پہلا رنگ سرگودھا اور لائل پور کے جیلوں میں ان کی تین ہمینوں کی قید تھائی کا  
ہے۔ وہ بہت مشکل دل تھے۔ کاغذ، قلم، دوستات، کتابیں، اخبار، خطوط سب چیزیں  
ممنوع تھیں۔ انہوں نے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے

متاعِ لوح و قلم چھین گئی تو کیا غم ہے  
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے  
زبان پر مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے  
ہر ایک حلقة زنجیر میں زبان میں نے

صرف ایک شش الدین تھے جو نوابوں، جنوں، بھوتوں، دیووں، پریوں،  
حاملوں، معمولوں سے اپنے معاملات کے قصے سنائے کہ فیض صاحب کا جی بہلایا کرتے  
تھے۔ حیدر آباد میں تو فیض صاحب ان کے ذکر سے بھر پور تھے۔ آج کل بھی اکثریاد  
کرتے رہتے ہیں۔ اس قید تھائی کا ان پر اتنا اثر ہوا تھا کہ حیدر آباد پہنچنے پر وہ اکیلا  
رہنے سے بہت وحشت کھاتے۔ اپنی اپنی کوٹھریوں کے علاوہ ایک ہال بھی ہمارے  
سپرد کیا گیا تھا۔ ہمیں اجازت تھی کہ جہاں چاہیں بستر جمالیں۔ ہن اپنے اپنے  
کمرے میں رہنا چاہتے تھے۔ لیکن فیض صاحب ہال میں رہنے پر مصر تھے۔ کہتے  
تھے کہ تمہیں میری تھائی میں رہنا پڑتا تو دوستوں کی صحبت کی قدر ہوتی۔ لیکن ان پر یہ  
حالت زیادہ دیر طاری نہ رہی اور کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔  
اب ان کا بیشتر وقت ہمیں اپنے کمرے سے نکالنے میں صرف ہوتا تھا۔

تھے۔ یوپی کے رہنے والے تھے ☆  
 فیض صاحب کہا گرتے ہیں کہ ان دنوں ان کی طبیعت میں بہت زوروں کی آمد  
 تھی اور طرح طرح کے مضامین سوجھ رہے تھے۔ اس دوران کا کلام پچھتو ان کے  
 ذہن سے اتر گیا۔ جونق گیا وہ دست صبا میں مندرجہ ذیل مندرجات پر مشتمل ہے  
 متاع لوح و قلم  
 دامن یوسف  
 طوق و دار کاموسم (پہلا حصہ)

ترجمہ نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے  
 تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں  
 شفقت کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارہ شام  
 کچھ کلام ایسا بھی ہے جو صرف سینہ پر سینہ چل سکتا ہے اور جس سے فیض صاحب  
 صرف مخصوص دوستوں کو نوازتے ہیں

ان کی شاعری کا دوسرا رنگ حیدر آباد کا ہے۔ یہاں ہمیں ہر طرح کا جسمانی  
 آرام جو نیل میں ممکن ہو سکتا ہے، میر تھا

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے  
 کیسی حالت تھی کہ ظاہری آرام و آسائش کے پردے میں ہزاروں حرثوں کا  
 خون اور لاکھوں تمناؤں کا قبرستان تھا ہمارے خلاف کئی تعزیری و فعیں ایسی لگی ہوئی  
 تھیں جن کی سزا موت تھی۔ اس کے ساتھ صفائی پیش کرنے کی سہوتیں بہت حد تک

ہمیں میر نہیں تھیں۔ لیکن ہم نے سمجھ رکھا تھا

در بیاباں گر بشو ق کعبہ خواہی زد قوم

سر زشہا گر کند خار مغیال غم مخور

اور وقتی طور پر شور و غوغاء، ہاؤ ہو، گالی گلوچ کے ذریعے آنے والے خطرے کی  
آہٹ کو دبائے ہوئے تھے۔ ڈیڑھ دو سال ہمارا موضوعِ خن صرف فتح رہا۔ مجھے یاد  
نہیں پڑتا کہ میرے سامنے کسی نے کبھی شکست کا ذکر کیا ہو۔ ہم سمجھتے تھے کہ ایسا ذکر  
ایک دفعہ شروع ہو گیا تو نہیں رکے گا۔ ہم فوج کے اس مشہور مشق لے پر عمل کر رہے  
تھے کہ جب مدافعت کی صورت نہ رہے تو دھاواں ول دو۔ چنانچہ شروعِ دن سے ہم  
عدالت کے اندر حسبِ توفیق غلغہ اندازی کرتے رہے۔ فیض صاحب نے اس میں  
بہت کم حصہ لیا۔ لیکن ہمیں کبھی روکا بھی نہیں وہ اپنا جوش ولو لہ اپنے شعروں میں  
منعکس کر لیا کرتے تھے۔

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوان ہوس میں

بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنگار کھڑے ہیں

ہاں جرم وفا دیکھئے کس کس پہ ہو ثابت

وہ سارے خطا کار سردار کھڑے ہیں

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم

یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں

چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے

فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب وہ شب ضرور سر کوئے یا رگز ری

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی جل  
 عباۓ شیخ و قبائے امیر و تاج شہی  
 ہمیں سے سنت منصور و قیس زندہ ہے  
 ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و تاج گلہیں  
 اے خاک نشینو انہو بیٹھو وہ وقت قریب ۲ پہنچا ہے  
 جب تخت گرانے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے  
 عجز اہل حرم کی بات کرو  
 عشق کے دم قدم کی بات کرو

دیکھنے والے دیکھیں گے کہ دست صبا کے دوسرے حصے میں جوش و خروش کا وہ  
 عالم نہیں جو پہلے نصف میں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ کچھ عرصہ مقدمہ کی  
 سماعت ہو چکنے کے بعد ہمیں امید ہو چلی تھی کہ اگر عدالت کی کارروائی میں دلچسپی  
 لیں تو شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس لیے سوچ بچارے نے شور یہہ سری پر  
 سبقت لے لی تھی۔ اس کی دوسری وجہ ان کے بھائی کی اندوہناک موت تھی۔ وہ  
 حیدر آباد ان سے ملنے آئے اور اپنے ایک روحانی پیشواؤ کی طرف سے ان کی رہائی کی  
 خوشخبری لائے تھے۔ ابھی حیدر آباد میں ہی تھے کہ 18 جولائی 1952ء کی صبح کو نماز  
 پڑھتے ہوئے اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ فیض صاحب کو اتنا صدمہ ہوا کہ ہمیں ہو  
 تک نیم مردہ حالت میں رہے۔ ایک دن تو چارپائی سے اترتے ہوئے بے ہوش ہو  
 کر فرش پر گر پڑے۔ آوازن کر میں اور عطا بھاگے بھاگے گئے اور زمین سے اٹھا کر  
 بستر پر لٹایا۔ یہ گھاؤ ابھی تک بھرا نہیں ہے۔ گوانہوں نے حسب حادث اسے کیمو  
 فلاج (Camouflage) کر لیا ہے۔

فیض صاحب کی کیموفلافاج کرنے کی حادث بھی عجیب ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ

سگریٹ ختم ہو گئے لیکن بجائے اس کے کہ ساتھیوں سے مانگ لیں بے قراری دور کرنے کے لیے احاطہ کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ اس بے قراری کی تشخیص میں ہمیں کافی عرصہ لگا۔ ان کو تھپکلوں سے بہت گھن آتی تھی۔ میرے خیال میں خوف کھاتے تھے۔ ایک دن ہم سب برآمدے میں چار پاپیاں ڈال کر سونے کی تیاری میں تھے کہ فیض صاحب نے دفعتاً اٹھ کر ادھر ادھر چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ عطا کی چار پاپی کے پاس ہی تھی۔ اس نے سوچا کہ ڈال میں کچھ کالا ہے۔ ہاتھ کی طرف دیکھا تو سگریٹ سلگ رہا تھا۔ فیض صاحب کی نظر میں کاپیچا کیا، دیکھا کہ ان کی نظر میں بار بار حچھت کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ چار پاپی کے پاس آتے تھے اور آگے نکل جاتے تھے اور گوم کر یہی عمل دہراتے تھے۔ عطا نے چھپکی کو دیکھ لیا اور اٹھ کر فیض صاحب کی چار پاپی کھینچ کر ایک طرف کر دی۔

تیسرا نگ کراچی کا ہے جہاں فیض صاحب دو ماہ کے لیے مقیم رہے۔ دراصل یہ رنگ دوسرے اور چوتھے کی درمیانی کڑی ہے۔ کراچی میں ہسپتال میں فیض صاحب جیل کی نسبت قدرے آزاد فضا میں رہے۔ دوستوں کے ساتھ بغیر کسی تباہت کے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ وہاں انہیں اوجوہ آزادی کی نعمتوں کا شدت سے احساس ہوا۔ اس شدید احساس کے بعد جب وہ منتظری آئے تو قید کا احساس بھی شدت پکڑ گیا اور ان کی شاعری میں ظاہر ہوا۔ اسی لیے انہوں نے کراچی اور منتظری میں لکھی ہوئی غزلوں اور نظموں کے مجموعے کا نام زندان نامہ تجویز کیا ہے۔

کراچی میں فیض صاحب نے اپنی معرکتہ الاراظم ملاقات لکھی۔ اس نظم کا پہلا بند اکتوبر 1953ء میں مشتمل ہوا تھا اور دوسرا اور تیسرا نومبر میں اسے کراچی سے اس لیے منسوب کر رہا ہوں کہ وہ اس کے جراثیم کراچی سے لائے تھے۔ اس میں اس ماہی بے آب کی رُتپ ہے جس پر جانوز محرومی کے بعد کچھ پانی چھڑک دیا گیا ہوا اور وقتی سکون کے باوجود وادے اس بات کا شدت سے احساس ہو کہ

تحوڑا ساپانی جو اسے میر آیا ہے، سو کھنے والا ہے۔ یہ نظم درد کی انتہائی شدت کے ساتھ انہی تسلیکین کی بھی مظہر ہے۔ اس میں ایمان و ایقان کی جگہ گاہٹ بھی ہی، اس میں انسانی حوصلہ، عزم اور حکمت کا راگ بھی گایا گیا ہے۔ ایسا حوصلہ، عزم اور حکمت جو صرف آج کے انسان کا طرہ امتیاز ہیں جو دھرتی ماتا پر نہایت مضبوطی سے قدم جما کر ستاروں پر کندیں پھینک رہا ہے اور مہتاب پر شبنون مارتے کی فکر میں ہے، جو پانی، ہوا، دنیا، سمندر، برق و باریں اور کائنات کی دوسری پریوں اور دیوؤں کو مخفر کر چکا ہے، یا ان کی تسبیح کیا جا بتا ہے، جس کی سینکڑوں، ہزاروں سالوں کی الٰم نصیبی اور جگر فگاری کے انبار آج ان کے لیے حرکت اور حادث کا منع بنئے ہوئے ہیں۔

فیض صاحب کی بیل کی شاعری کا چوتھا نگہداشت نگمری کا ہے۔ یہاں ہمیں کم و بیش حیدر آباد کی سہ لوگوں میسر تھیں۔ بیل کے ارباب اقتدار بھی نیک دل لوگ تھے، جو بیل کے قواعد و ضوابط سے سرموا نحراف نہ کرنے کے باوجود ہماری دل شکنی نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان میں بعض اچھے ذوق کے لوگ بھی تھے جو ہمارے ساتھ ادبی چھیڑ چھاڑ جاری رکھتے تھے۔ ایک صاحب کو تو ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ ان کے آنے کے کچھ ہی لمحوں کے بعد فیض صاحب طویل کی طرح چھانے لگتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگوں نے ان پر کم گولی کا الزام تراش لیا ہے۔ ان صاحب کو چرکیں سے لے کر مرازا غالب تک کے سب شعراء کے کچھ نہ کچھ بھلے برے شعر یاد تھے اور انہوں تیرتھ رام فیروز پوری کے نالوں سے لے کر سعادت حسن منلوکی کہانیوں تک سب کچھ پڑھ رکھا تھا۔ وہ آتے ہی علیک سلیک کے بعد شروع ہو جاتے اور فیض صاحب کی طرف سے توجہ ہونے نہ ہونے کی پرواکے بغیر یہاں سے وہاں، وہاں سے کہیں اور کچھ نہ کچھ کہتے رہتے، حتیٰ کہ فیض کی کوئی ایسی رگ چھڑ جاتی کہ غصے میں یا مونج میں آ کر ان سے کچھ کہئے بغیر رہانے جاتا۔

نگمری میں فیض صاحب کو اپنی بیوی بچوں اور دوسرے دوستوں رشتہ داروں

سے ملاقات میں بھی آسانیاں تھیں۔ دل بہاؤے کے لیے ہم نے اپنے احاطے کے اندر ایک پھلواری بھی بنالی تھی جس کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے سارے جیل میں پھیل گیا تھا بلکہ جیل کے باہر بھی لوگوں کو پھولوں کی پیغمبری مہماں کی جاتی تھی۔ فیض کو پھولوں کا شوق اتنا تھا کہ انہوں نے ولایت سے اپنی خوشداں اور ایک دوست کے ذریعے پھولوں کے بیچ منگوانے۔ پھول ایک بڑھنے پھولنے پھلانے کی چیز ہے۔ ان سے جیل میں خوبی بہلتا ہے، اور کوئی نہ کوئی نئی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آدمی قید کا ایک ایک دن گزر کی ہجائے موسم گزناہ ملتا ہے جو طویل سے طویل قید میں بھی انگلیوں پر گئے جاسکتے ہیں۔ ساتھ ہی نظریں مستقبل کی طرف رہتی ہیں کہ آنے والے موسم میں پھول لگانے کے لیے کیا کیا بندوبست کرنا ہے اور گزشتہ نفلطیوں کے اعادے سے بچاؤ کی کیا صورت ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود نگرانی میں فیض صاحب کو قید کا بہت شدید احساس تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حیدر آباد سے تبدیلی پر یاروں دوستوں سے جداگانی کا بہت قلق تھا۔ ایک طرح سے بھرا گھر اجز گیا تھا۔ دوسری وجہ سے بیان کر چکا ہوں کہ کراچی کے دوران قیام کی نسبتاً آزاد فضا کے بعد قید کا بو جھز زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ سب سے بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ مستقبل قریب میں رہا ہو جانے کی امید کا جومو ہوم ساچرائی اب تک جلتا رہا تھا وہ اب خاموش ہو چکا تھا اور شروع شروع کی قید تھائی کارنگ ایک حد تک عود کر آیا تھا۔ درود غم کا طوفان اللہ پڑا تھا۔ اب وہ جیل کی دیواروں، دروازوں، سلاخوں، پھرہ داروں کو غور سے دیکھنے لگے تھے۔ پہلے باہر کی دنیا کے ساتھ تخلیل کا بلا واسطہ تعلق تھا اب اسے بھی جیل کی دیواریں چاہند کر آنا پڑتا تھا۔

ہم الٰہ قفس تھا بھی نہیں، ہر روز شیم صح وطن  
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

اس شعر میں شیم صح وطن کی دیواروں کو پھاندنے کی سرراہٹ صاف سنائی دے رہی ہے اور اس کا ہجراء نصیب قیدی کو جیل والوں کی نظروں سے بچ کر یادوں کا تخفہ دینا اور اس کے آنسوؤں کی سوغات لے کر جانا بھی نظر آ رہا ہے۔

جب تک سوننی کامیابی سے چناب کو عبور کر کے مہینوال کو مل لیا کرتی تھی۔ اس وقت تک اس کے زہن میں چناب کی اہروں اور گھرے کی پختگی کا ایک موہوم تصور تھا۔ اس کی ساری اوجہ مہینوال پر مرکوز رہتی تھی کہ وہ کیسا ہو گا، لیے ملے گا اور رخصت کے وقت دل پر کیا گزرے گی۔ جب وہ پکے گھرے کی بدولت دریا میں ڈوبنے لگی، اس وقت نظریاں یارگی لکھیا پڑھیں۔ لیکن کوئی وقت ایسا ضرور آیا ہو گا، جب پوری شدت کے ساتھ اس کو دریا کی سختی کا احساس ہوا ہو گا اور پکے گھرے کی چکنی مٹی ہاٹھوں میں محسوس کر کے پکا گھر ابھی یاد آیا ہو گا اور جب وہ مہینوال کی خاطر اپنی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو گی تو ایک لمحے کے لیے مہینوال کا تصور بھی ذہن سے اتر گیا ہو گا۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران میں فیض صاحب کا تصور باہر کی دنیا کے ساتھ بہت مضبوطی کے ساتھ جمارتا۔ جیل کی زندگی نے یہ رشتہ اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ دستِ صبا کے آخر میں فیض صاحب کی دو حسین و جمیل نظمیں زندگی کی ایک شام اور زندگی کی ایک صح اس پر شاہد ہیں۔ یہاں انہوں نے زندگی کے کریبی المنشد دیو کی ہیبت نا کی کاپورا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ لیکن ان کے چہرے پر تحریر آمیز مسکراہٹ ہے اور انہوں نے مسرت و شادمانی کے ایسے ذرائع نکال لیے ہیں، جو زندگی کے عفریت کے احاطہ قدرت سے باہر ہیں۔

دل سے پہم خیال کہتا ہے  
اتی شیریں ہے زندگی اس پل  
ظلم کا زہر گھولنے والے  
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

چاند کو گل کریں تو ہم جائیں

گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمن جاں  
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنات گراں  
جن کے چنگل میں شب و روز زین فریاد کناں  
میرے بیکار شب و روز کی نازک پر پیاں  
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیں  
جس کے ترکش میں ہیں نامیدہ کے جلتے ہوئے تیر

کراچی کے قیام کے بعد یہ ظلم وحشی اور غلکھری میں جیل اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ روپیوا آگیا۔ پناہ چانچل کے درود نے دنیا بھر کے اسیروں کے رنج و الم کو اپنے اندر سموالیا تھا۔ کینیا کے باشندوں پر جمہوریت اور آزادی خ ندوے داروں کے ہاتھوں بے پناہ ظلم و ستم اور ان کے اپنے وطن کے مصائب فیض صاحب کے لیے سوہان روح بنے ہوئے تھے۔ وہ افریقی عورتوں کے کارہائے نمایاں سے خاص طور پر متاثر تھے۔ کئی دفعہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ پاکستانی نہیں رہے، افریقی بن گئے ہیں۔ ان کی نظم آجا والی فرقا اس کی مظہر ہے۔

ہم جو تاریک را ہوں میں مارے گئے۔ روزنبرگ (Rosenberg) جوڑے کی بے مثال قربانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ یہاں وہ مرتبے دم تک انسانیت کے مستقبل، انقلاب یا محبت یا ان سب کے ساتھ اپنی وفاداری جلتاتے رہتے ہیں۔ اس نظم کی آفاقیت (Universality) عجیب و غریب ہے۔ اس نے صدیوں کو پاٹ کر ہر زمانے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے، ہر ملک کے شہیدوں کو ایک صفحہ میں کھڑا کر دیا ہے۔ یہ نظم کر بلہ، پلاسی، ہرنگا پشم، مددگی، جھانسی، جلیانوالہ، قصہ خوانی، شالمن گراڈ، ملایا، کینیا، کوریا، تلنگان، مرکاش، طیونس سہنی سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور طہران، کراچی اور ڈھاکہ کی سڑکوں پر دم توڑے طلباء،

مراکش طیونس اور کینیا اور ملایا کے خون میں لٹ پت مجاهد، سب ایک ہی جانورو زنگرہ  
دھراتے سنائی دیتے ہیں

تیرے کوچے سے چن کر ہمارے علم  
اور نکیں گے عشق کے قافی  
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم  
مخض کر چلے درد کے فاصلے

ہم ملکمری میں ہی تھے کہ ایرانی مجاہد ڈمن کو جیل میں گول کا نشانہ بنانے کی  
مفصل رو داد امریکی رسالہ نام میں آئی۔ ساتھ ہی ان کی قتل کاہ میں لی گئی تصویر بھی  
تھی۔ سعدی اور حافظ کے وطن کے فیض صاحب کو خاص محبت ہے۔ کئی دن  
مضطرب رہے اور بالآخر ان کا اضطراب آخری رات کی شکل میں خودار ہوا۔ یہ لظہ ان  
خیالات و تصورات کی ترجمانی کرتی ہے قیدی کے ذہن میں اس رات گزرتے ہیں  
جس کی صبح کو اسے شہید ہونا ہوتا ہے۔ انسانیت کی راہ میں بھے ہوئے خون کے  
کرشمہ سازیاں دیکھئے، شہداء کہاں کہاں اور کس کس رنگ میں نئے روپ دھار لیتے  
ہیں

کشتگان خجڑ تسلیم را  
ہر زماں از غیب جان دیگر است  
فیض صاحب کی اس زمانے کے ذہنی کیفیت کی پوری پوری ترجمانی اگر کوئی لظہ  
کرتی ہے وہ دریچہ ہے

ملکمری سے دانتوں کے علاج کے سلسلے میں کوئی تین ہفتے کے لیے  
مارچ 1954ء میں لاہور آنا پڑا۔ لاہور سے فیض صاحب کو والہانہ محبت ہے۔  
وہ لاہور، آنا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے دل پر بارگز رے گا۔ یہاں آ کر  
لاہور کا پانی پیا۔ اس کی فضا میں سانس لیا، لاہور کی آوازیں سنیں اور لاہور کے بعض

گاموں ماجھوں سے جو ختم نبوت تحریک کے سلسلے میں جیل میں آئے ہوئے تھے، ملاقات ہوئی اور اس کے دلدو زنظم اے روشنیوں کے شہر کاظمہ رہوا، جس پر کوئی شہر جتنا بھی خر کرے بجا ہے۔

فیض صاحب کے دل میں لاہور اور لاہور والوں کی محبت کا جوش ایک دفعہ پہلے بھی اللہ پر اتھا۔ جب 1953ء میں لاہور کے گلی کوپے اس کے فرزندوں کے خون سے نکلیں ہو گئے تھے۔ لاہور کے نام بھی تک لاہوری ہے۔

ملکمری میں ان کی شاعری کے بارے میں ہیری اور ان کی کافی بحث و تجھیس ہوا کرتی تھی۔ میں کوئی نہ کوئی بات کہتا رہتا تھا اور ان کو جواب دیے بغیر چارہ نہ تھا۔ شاعر اور ماعروف الامعالہ تھا۔ راہ مفریکیں ہی تھیں کسر کار کے آگے سر تسلیم ختم کر کے مجھ سے بخجات پاتے۔ اس کا سوال ہی پیدائشیں ہوتا تھا۔ لہذا مرتا کیا نہ کرتا۔ آج کل بھی مذاقا کہا کرتے ہیں کہ زندگی نامہ کے زندگی نامہ ہونے میں تمہاری وہابیت کا بھی دخل ہے۔

فیض کی جیل کی شاعری میں وطن کی محبت کے چشمے ہر طرف پھوٹ رہے ہیں۔ وہ جا بجا اپنے دلیں اور اس کے باسیوں کی خستہ حالی، قوم کی عزت و ناموں کی ارزانی، لوگوں کی ناداری، جہالت، بھوک اور غم کو دیکھ دیکھ کر بے طرح تڑپ رہے ہیں۔

ثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں  
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے  
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے  
نظر چا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے  
بعض دفعہ کچھ اور نہیں بناتا تو خیالی پلاوپکانے لگتے، اور جیل کی کال کوٹھری میں  
بیٹھ کر بھی گرداؤو، پر یشاں حال لیا اے وطن کو بناسنوار او بکھنا چاہتے ہیں

بجھا جو روزن زندان تو دل یہ سمجھا ہے  
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی

چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے  
کہ اب خیرتے رخ پر بکھر گئی ہو گی

وطن کی محبت اس طرح ان کے رگ مپے میں سرایت گئی ہے کہ اب اس کا  
دوسرا محبتوں سے علیحدہ کر کے دیکھنا ممکن ہو گیا ہے۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیالے وطن کو  
ترپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں  
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائش منزل  
رخسار کے خم میں کبھی کا کل کی شکن میں

زندان میں نہ جانے کیا بات تھی کہ ہم سب کی حب وطن معمول سے زیادہ جوش  
پر تھی۔ صح شام پاکستان کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ بے بسی نے مزاجوں میں چڑھا اپنی پیدا  
کر دیا تھا۔ کبھی غصب ناک ہو جاتے تھے کبھی گریہ وزاری کو جی چاہتا تھا۔ دست و پا  
تو ناکارہ کر دیے گئے تھے لیکن دل و جاں پر آفت آئی ہوئی تھی۔

1951ء میں جب ہندوستان کے پاکستان کی طرف جارحانہ ارادوں کی  
خبریں شائع ہوئیں تو ہم میں سے ان افسروں نے جوابی تک معزول نہیں کیے گئے  
تھے، گورنمنٹ کو درخواست دی کہ پاکستان کی حفاظت میں ہم کو بھی جان لڑانے کی  
اجازت دی جائے، خاص طور پر جبکہ ہر ایک کشمیر میں ہندوستانی فوجوں سے اڑنے  
کا تجربہ ہے۔ درخواست میں واضح کر دیا گیا تھا کہ ہمارا مقصد مقدمے سے جان  
چھڑانے کا نہیں۔ ہم گورنمنٹ سے سوائے اس کے کچھ نہیں چاہتے تھے کہ ہنگامی  
حالات کے دوران میں مقدمے کو ملتوی کر دیا جائے۔ یہ کوئی سٹنٹ (Stunt)

بھی نہیں تھا، اس لیے کہ ہمیں معلوم تھا کہ ہندوستانی فوجوں کے شانہ بٹانے ہندو

سچائی اور اکالی درندے بھی ہوں گے اور مغربی پاکستان سے کوئی راہ مفر نہیں تھی۔  
ہماری درخواست مسترد کر دی گئی۔ بہر حال زمانہ کھرے کھولے کی تمیز زود یا پدیر کر  
ہی لے گا۔

نظیری کاش نہماں کہ در ساغر چہ می داری  
کہ پیش زاہدان قدر گنہگاران شوہ پیدا  
ہندوستان اور پاکستان کا ذکر چل اکا ہے۔ جیل میں فیض صاحب اکثر اپنے  
ہندوستانی دوستوں کو یاد کیا کرتے تھے ان میں کئی ایک لاہور کے رہنے والے  
تھے۔ کئی دوسرے ساہماں تک پنجاب میں رہ کے تھے مولانا حضرت مولانا،  
رشید جہاں، صاحب زادہ محمود الطقر، اصرار الحق مجاز، مخدوم محی الدین، علی سردار  
جعفری، پنڈت ہری چندا ختر، اپندرنا تھاٹھک اور ان کی بیگم، ملک راج آنند، کرشن  
چندر، ڈاکٹر اشرف، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور دوسرے کئی اصحاب کا ذکر  
میں نے اتنی دفعہ سنائے کہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ ایک عرصہ سے جان  
پچان ہے، حالانکہ ان میں سے میں کسی ایک کو بھی ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ سجاد ظہیر  
اور فیض اکٹھے ہو جاتے تھے تو پھر با تین ہی اکثر ان لوگوں کے بارے میں ہوا کرتی  
تھیں۔

1948ء کے فسادات کا زمانہ فیض صاحب نے لاہور میں گزارا تھا۔ انہی  
دنوں وہ مشرقی پنجاب بھی ہو آئے تھے۔ طرفین کے بہادروں اور سورپریزوں نے  
جس طور پر انسانیت کو ذلیل کیا تھا، اس کا آنکھوں دیکھا حال اکثر سنایا کرتے تھے۔  
بیان کرتے کرتے رقت طاری ہو جاتی اور رک جاتے۔ میرے خیال میں وہ اتنے  
بڑے پیانے پر اس تفصیل سے اس ہولناک خانہ جنگلی کو دیکھنے پر مجبور رہے ہیں کہ  
شعروں میں اس کو لانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ وقت ملنے پر وہ ناول یا  
ڈرامے کے ذریعے پنجاب کی اس ٹریجندی کو بیان کریں۔ پنجاب کی سر زمین یوں تو

ہزاروں سالوں سے حملہ آوروں کی تاخت و تاراج کا شکار رہی ہے۔ شایدی ہی یہاں کی کوئی نسل ایسی گزری ہوگی جس نے غیر ملکی گھوڑوں کے سموں کی ٹاپ نہ سنی ہو۔ لیکن ان حملہ آوروں میں سے اکثر بگولے کی طرح آتے تھے اور آندھی کی طرح گزر جاتے تھے۔ توارکے سائے تلے جینے کی ذلت کچھ کم نہیں ہوتی، لیکن 1947ء میں جس طرح پنجابیوں نے پنجابیوں کو ذلیل و خوار کیا، تمام حملہ آوروں نے مل کر بھی نہیں کیا ہوگا۔ امر تا پر یتم کے الفاظ میں

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراء و چوں بول  
تے اج کتاب عشق وا کوئی اگلا ورقہ پھول  
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین  
اج لکھاں وصیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن  
اٹھ ورد مندراء دیا دردیا، اٹھ تک اپنا پنجاب  
اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لھو دی بھری چناب  
کے نے پنجاں پانیاں وچ دتی زہر ملا  
تے اوپھاں پانیاں دھرت نوں دتا زہر پلا  
دھرتی تے لھو وسیا قبراء پیاں چون  
پریت دیاں شہزادیاں اج وچ مزاراء رون  
اج سمجھے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور  
اج کھوں لیا یئے لبھ کے وارث شاہ اک ہور

فیض صاحب پاکستان میں بعض اصحاب کے اس نظریے پر بہت رنجیدہ خاطر ہوا کرتے تھے کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق ہندوستان سے بھی ہے، پاکستان کے لیے زہر ہلامی ہے۔ ریڈ یو پرسوائے اقبال کے کلام کی قولیوں اور فلمی گاؤں کے کچھ سنئے میں نہیں آتا۔ چنانچہ ہم جیل والوں سے فتح بچا کر، ہندوستانی ریڈ یو سٹیشنوں سے

اپنے دلیں کے راگ سناتے تھے۔ کسی جاہل نے بزمِ خودو می جوش میں آکر امیر خرو، تان سین، واجد علی شاہ، عبدالکریم خان، فیاض خان اور دوسرے بیسوں اساتذہ اور زعماء سے پاکستان کا رشتہ توڑنے کو عین حب الوطنی سمجھ لیا تھا۔

ملکوں کی سیاسی و اقتصادی حدیں وقت کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہی ہیں۔ لیکن ایک خطہ زمین کے ٹھہر، زبان، ادب، آرٹ، موسیقی، فن، تعمیر اور دوسری ثقافتی قدروں کا قوم سینکڑوں، ہزاروں سالوں کی ریاضت کے بعد تیار ہوتا ہے اور اس کی بنیادی ترکیب میں تبدیلی آسان ہیں ہوتی ہے پاکستان اور ہندوستان میں سیاسی و دینی گامشی کیسی بھی صورت اختیار کر جائے دلی، لکھنؤ، حیدر آباد اور لاہور کی گنگا جمنی تہذیبیں اپنی جگہ قائم رہیں گی اور ایسا اور غالب میں سب کی سانجھ رہے گی۔ ہندوستانی اور پاکستانی تہذیبوں کے درختوں کی جذریں موئی بھوڑا رو، گیا، ہرش پور، گندھارا، نیکسلا، متحرا، بنارس، اجظا، اجیمیر، قطب مینار، تاج محل، جامع مسجد، شالامار ہر جگہ پھیلی ہوئی ہیں۔ شاخوں میں کہیں سمر قندو بخارا اور کہیں عرب و عجم سے آئے ہوئے پیوندا پنی بھار و کھار ہے ہیں اور کہیں پر اچھین ڈالیں جوں کی توں قائم ہیں۔ دوسرے کی ضد میں جڑوں کو نقصان پہنچانا یا شاخوں کی نوج کھوٹ کرنا اپنے پاؤں پر آپ کھاڑی مارنا ہے۔

فیض صاحب ان انسانیت نواز روایات سے تعلق رکھتے ہیں جو ہزاروں سالوں سے دونوں ملکوں کی سر زمین کا خاصہ رہی ہیں۔ وہ اسی سلسلے کی کڑی ہیں، جسے امیر خرو، بھگت کیر، خواجه معین الدین چشتی، بابا نانک، بابا فرید، ابوالفضل، فیضی، بلحے شاہ، وارث شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی، رحمان بابا اور دوسرے بہت سے بزرگوں نے فیض بخشنما ہے۔

حیدر آباد میں ان کا درس و مدرسہ کا سلسلہ عجیب متنوع قسم کا تھا۔ کوئی قرآن مجید اور حدیث شریف کا درس لے رہا ہے تو کوئی صوفیائے کرام کی تصانیف فتوح الغیب،

کشف الحجوب، احیاء العلوم وغیرہ کے روزوں کات سمجھ رہا ہے۔ کوئی انگریزی اور یورپین ادب کی الجھنیں پیش کر رہا ہے تو کسی نے مارکسی جدالیاتی فلسفے پر بحث شروع کر کھی ہے۔ اردو فارسی تو تکمیل کام تھا۔ حیدر آباد میں ہم نے ان کو شاگرد کے روں میں بھی دیکھا ہے۔ پوشنی کے ساتھ مل کر سجاد ظہیر سے فرانسیسی زبان سیکھا کرتے تھے۔ نہایت غنی اور کام چور تھے۔ سید صاحب کی استادانہ گھر کیاں اور فیض صاحب کی بہانہ سازیاں بہت لطف پیدا کرتی تھیں۔

محنت کشوں سے انہیں خاص اقتدار ہے جیہے حیدر آباد میں ایک بار ہمارے احاطے میں بجلی کے کھمبے کا فیوز (Fuse) جعل گیا۔ ایک مستری بغیر سیری ہمی کے وہاں پہنچ گیا۔ ہم تملانے لگے کہ خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کے لیے آگیا ہے۔ اس نے کھمبے کو ذرا ٹھوڑا بجا یا اور یہ جاوہ جا۔ بغیر سیری ہمی کے کھمبے کے سرے تک پہنچ کر آنکھ جھکانے میں نیاز فیوز لگا آیا۔ فیض صاحب ویر تک اس کے قصیدے پڑھتے رہے۔ نلگمری میں شاہ جی ایک پوسٹ میں، ہمارے پارسل وغیرہ لایا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر فیض صاحب کی آنکھوں میں جس قسم کی روشنی آ جالیا کرتی تھی وہ میں نے کم ہی دیکھی ہے۔ دونوں ٹریڈ یونیون کے ممبرہ چکے تھے۔ کہا کرتے ہیں کہ ہندوستان پاکستان کے مسائل کا حل ایک ہی ہے کہ دونوں ملکوں میں محنت کش اپنے حقوق حاصل کر کے اپنے اپنے چمنستانوں کے والی بن جائیں۔ اس کے بعد ان ملکوں کے درمیان نفرت کا زہر اور اس کو پیدا کرنے والے حل طلب مسائل، جن کی آڑ میں سامراجی آج کل اپنے آہنی پنج وطن عزیز کی رگوں میں دوبارہ پوسٹ کر رہے ہیں، یوں غائب ہو جائیں گے جیسے دیووں پر یوں کے قصور میں ہیرو کے اسم پڑھنے پر دیو بھوت اور دوسرا بلامیں آنا فانا رفع وفع ہو جاتی ہیں۔

فیض کی شاعری میں ایک صاحب دل کا جوش اور ولہ ہے۔ اس میں قوم کی قوم کا دل دھڑک رہا ہے۔ لیکن شاید کیا بات کہ اس کے قوام میں پاکستان کے محنت

کشون کا مبارک پیمنہ اور خون کی حرارت ابھی تک پوری مقدار میں شامل نہیں ہیں۔ سمن و گلاب کو جس چاہت سے یاد کیا ہے۔ اسی چاہت اور تفصیل سے اس بد حال بد نصیب کا ذکر نہیں ہے، جس نے سمن و گلاب کو اپنے خون جگر سے بیخ کر شاداب کیا ہے اور جس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی ان سمن و گلاب کی زناکتوں، رنگ روپ اور عطر بیز یوں سے مستفید ہو سکے۔ ان کا دل تو ادھر کھنچا جا رہا ہے لیکن

### لغوش پا میں ہے پابندی آداب ابھی

ان کی شاعری کوڑا نگ روموں، سکولوں، کاجوں سے نکل گرسٹ کوں بازاروں، کھیتوں اور کارخانوں میں ابھی پھیلانا ہے۔

وہ کہتا کرتے تھے کہ یہ چیز صرف پنجابی میں ہو سکتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ ان کی معمول کے مطابق کسر نفی ہے اور جملی انکھا ہٹ دست صبا کے ابتدائی میں انہوں نے فرمایا ہے یوں کہتے کہ شاعر کا کام صرف مشاہدہ ہی نہیں، مجاهد بھی اس پر فرض ہے۔ گردو پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی پہنچانی پر ہے۔ اس کو دوسروں کو دکھانا اس کی فتنی دسترس پر، اس کے بھاؤ میں وغل انداز ہونا، اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں آگے فرمایا ہے کہ حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا اور اک اور جدوجہد میں حصہ تو فیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ زندگی نامہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ فیض صاحب کے مشاہدہ اور مجاهد کے تناسب میں مجاهد کا پلڑا بھاری ہو رہا ہے اور یہی اس وقت ان کے فن کے تقاضا بھی معلوم ہوتا ہے۔

اب ان کی نظریں لاہور کے مناظر سے اٹھ کر پاکستان کے وسیع میدانوں پر پڑنے لگی ہیں۔ جہاں بے شمار انسان نماشی کے تودے صد یوں سے ایک ہی طرح کی دھیمی دھیمی حرکت کر رہے ہیں۔ اب ان تدوں کی کمیں کچھ سیدھی ہو رہی ہیں ان کو اس بو جھ کا احساس ہو رہا ہے جو انہوں نے قرنوں سے اٹھا رکھا ہے۔ کیونکہ ان

پر آہستہ آہستہ یہ بھید کھیل رہا ہے کہ بعض دوسرے دیسیوں میں ان کے بھائی بندوں نے یہ بو جھاتا روایا ہے اور وہ لوگ اب انسانی عظمت میں برادر کے یک ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک طرح کافور ہے، کیونکہ وہ وورافت پر زندگی اور تو انسانی کی اٹھتی، گرتی، گھٹی، بڑھتی روشنی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن یہ لوگ اسی برہا کی ماری کی طرح جو اچانک اپنے پریم کو زندگی آتا دیکھے، ابھی تک لجارتے ہیں، شتر مار رہے ہیں اور اپنی کم مانگی اور پریشان حالت کو چھپانا چاہتے ہیں۔ فیض صاحب کی نظر میں کارخانوں میں بھی گھر رہی ہیں، جہاں کسانوں کے سماں میں وورا نسانی تخلیقی قوت اور اس کی عظمت کا درس حاصل کر رہے ہیں۔ فیض یہ سب سچھ خود کی نہیں دیکھ رہے اپنے لاہوری بھائی بندوں، دماغی مزدوں کی کرنے والے مصنفوں، فلکوں، چھوٹے دکانداروں، وکیلوں، ٹیچروں، طالب علموں، گاموں اور ما جھوں کو بھی دکھلا رہے ہیں اور پاکار رہے ہیں کہ کارگہہستی میں جو دن پڑ رہا ہے، اس میں حق و باطل کے لشکروں کو پچانو نا داری، دفتر، بھوک اور غم نے چوکھے پھراو کر کے تمہارے ساغر دل کو مکلوے مکلوے کر دیا ہے اور تمہاری عزت اور ناموس خاک میں ملا دی ہے۔

صہبائے غم جاناں کی پری کی بے حرمتی کر دی ہے لیکن

یادوں کے گریبانوں کے رفوا

پر دل کی گزر کب ہوتی ہے

اک بخیہ او ہیڑا ایک سیا

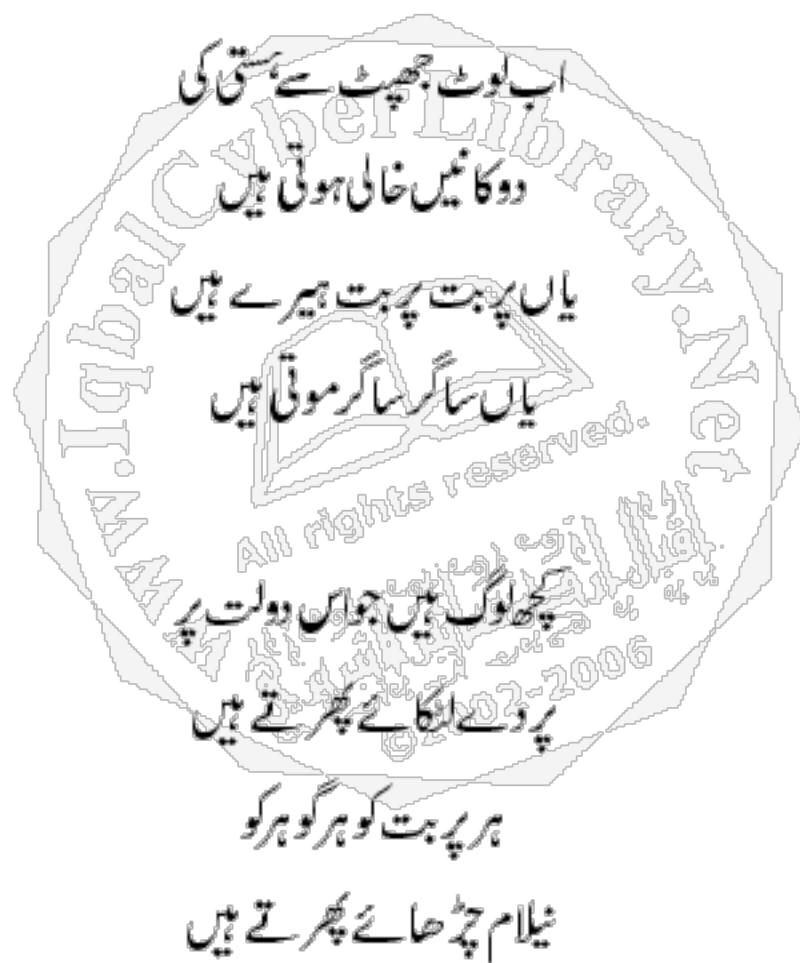
یوں عمر بس رکب ہوتی ہے

اس کارگہہستی میں جہاں

یہ ساغر شیشے ڈھلتے ہیں

ہرشے کا بدمل سکتا ہے

سب دامن پر ہو سکتے ہیں



کچھ وہ بھی ہیں جوڑ بھڑ کر  
یہ پردے نوچ گراتے ہیں  
ہستی کے اٹھائی گیروں کی  
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

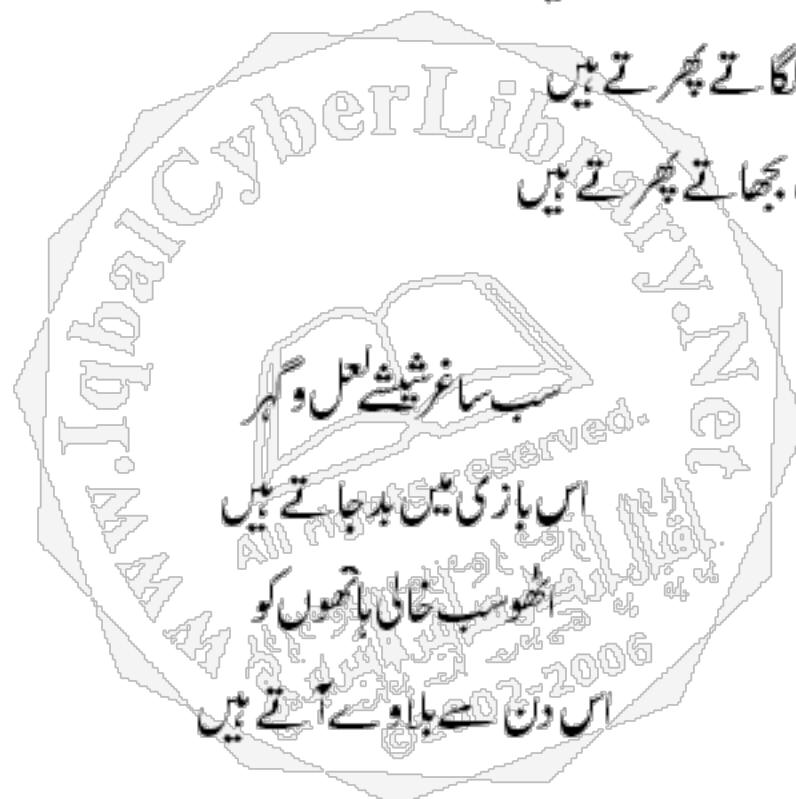
ان دونوں میں رن پڑتا ہے  
نہ بستی بستی نگرنگر  
ہر لمحے گھر کیت سینے میں  
ہر چلتی راہ کے مانچے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں

وہ جوت جگاتے پھرتے ہیں

یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں

وہ آگ بجھاتے پھرتے ہیں



زمدان نامہ میں فیض صاحب نے حق و باطل کی اس ہولناک جنگ میں بہادری کی بہادری کے واقعات کا مذکورہ شروع کر دیا ہے۔ اس کی ابتداؤہ دست صبا میں ایرانی طلبہ کے نام لکھ کر کرچکے ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کی یہ عادت پوری طرح نہیں کی گئی کہ وہ آتش فشاں پیارے کے دھوئیں کے پہلے مرغولہ (Puff) کو ہی لے پڑھتے ہیں۔ اور جب یہ دھواں ہوا کے جھونکوں سے چشم زدن میں تر تر ہو جاتا ہے تو رنجیدہ خاطر ہو جاتے ہیں یا طوفان کی پہلی موج میں ہی محو تماشا ہو جاتے ہیں اور جب اسے ساحل کی ریتی میں جذب ہوتا دیکھتے ہیں تو فرط درد سے بے حال ہو جاتے ہیں یا بڑھے ہوئے شکر کے سب سے اگلے سکاؤٹ جب کھیت ہو جاتے ہیں تو ان کو رُتپتا دیکھ کر تمام نظام کائنات کو آگ لگادینا چاہتے ہیں۔ ایسے درد کی فروانی ہر نیک دل کا خاصہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر آتش فشاں کی زمیں دوزگرج کو سنائیے اور اس کے چند لمحوں میں ابلنے والے کروڑوں من لاوا کا تصور کیا جائے یا پہلی لہر کے پیچے بھرے ہوئے بے کنار سمندر کا خیال کیا جائے تو دھوئیں کے پہلے مرغولہ کے

بکھر نے طوفان کی پہلی لہر کے جذب ہو جانے اور سکاؤں کے مرنے میں درد و غم کی جگہ مجاہد انہ را پ آ جاتی ہے۔ زندگی کے سائے گھرے ہونے کی بجائے اس کی زنگینیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان تینوں کی موت پر کوئے دھونے کی بجائے ان کی یادگار منانے کو مجھی چاہتا ہے۔ وہ عشق و محبت کے پہلے کشش ہی نہیں فتح کے باñی بھی ہیں اور ان کی موت زندگی کا رکن ہے۔ فیض صاحب کا کیتوں ذرا اور وسیع ہو جائے تو بلاشبہ ہمارے گورکی بن جائیں گے۔ ان سے زیادہ اس رتبہ کا اور کون مستحق ہے۔ بدعتی سے حالات کچھایے ہیں کہ ان میں رجز خوان ایک جان کے ساتھ کیا کچھ کر سکتا ہے۔

ملکگری میں میری ایک ڈیوٹی فیض صاحب کے لیے سامعین فراہم کرنا تھی اس کا ایک ذریعہ یہ تھا کہ میں ان کا تازہ کلام سید سجاد ظہیر صاحب کو مجھے حیل میں اور عطا اور پوشنی کو حیدر آباد بھیج دیا کرتا تھا۔ سید سجاد ظہیر کے ایک خط کا اقتباس اس مضمون کے اختتام کے لیے بہت مناسب رہے گا۔

### سنبل حیل، مجھے بلوچستان 21 فروری 54ء

آئندہ میں زیادہ باقاعدگی سے تمہارے خطوں کا جواب دوں گا۔ اس ارادے میں صرف اخلاقی فرض ہی کا تقاضا نہیں بلکہ میری خود غرضی بھی شامل ہے۔ تمہارے خطوں سے دوستی اور اتفاقات کی لطیف مہک آتی ہے۔ جس سے رنجور دل کو بے انتہا ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ اس طرح ہم تھائی میں گفتگو کر لیتے ہیں۔ حوزہ بہت فلسفیانہ اور ادبی موسیوں کا فیض کر لیتے ہیں اور ہمنی دیواروں میں کسی قدر رخنه ڈال کر جیسے نکلتے ہوئے سورج کی کرنوں سے ذرا دیر کے لیے دل و دماغ کو منور کر لیتے ہیں پھر اس کے علاوہ تم فیض کے کلام کے تختے بھی بھیجتے ہو اور اب کی بارتو تم نے اس کے انبار لگا دیے ہیں، ان کے لیے فیض اور تمہارا بہت بہت شکر یہ یہ تو ایسا عطا یہ ہے جس کا عوض مجھ سے کبھی اوپنیں ہو سکتا۔

فیض صاحب کی نظم ملاقات مجھے پسند آئی اس میں علام کی مرض نگاری اپنے  
کمال کو پہنچ گئی ہے اور پہلے مصرع سے شروع ہو کر (یہ رات اس درد کا شجر ہے) نظم  
کے بھاؤ کے ساتھ خوبصورت تشبیہوں اور استغاروں کے جیسے نازک پھول  
چاروں طرف کھلتے چلے گئے ہیں۔ جن میں ہر ایک ایسا ہے جو اپنی جدا گانہ خوبصوراً اور  
رنگ بھی رکھتا ہے اور دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ اور متوازن بھی ہے، پھر نظم کا  
بنیادی خیال پوری تخلیل کے ساتھ بڑی کامیابی سے ملایا گیا ہے، جیسے ایک حسین اور  
نازک جسم میں درونمند، حساس اور لطیف روح ہو۔ یہیں معلوم ہوتا کہ مجن، غمنا کی،  
شدت درد اور ان سب کے باوجود ہو، بلکہ ان کے میلے سے خود ادا ہونے والی ٹھیک سحر  
کے تصور کو گرفت میں لانے کے بعد شاعر نے اسے نظم کا جامہ پہنایا ہے، بلکہ یہاں  
پر یہ بلند ہمت آور خیال اور تصور جیسے شاعرانہ تخلیل کا ثرہ ہے اور پوری نظم کے گلستے  
سے دل آؤ ز اور روح افزار نگینیوں اور نکاتوں کے ساتھ جھک پڑا ہے، تیسرے بند  
کے شروع کے چار مصرعے، جہاں سے گرین کیا گیا ہے، اپنی فصاحت، موسیقیت،  
روانی اور زور کلام کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انہیں ایک بار پڑھ لو تو دل پر  
نقش ہو جاتے ہیں اور پھر بھولتے نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اتوار کی صبح کو کسی  
کلیسا کی گھنٹیاں لہک لہک کرنچ رہی ہوں اور ان کی مسلسل آواز صرف سامعہ میں  
نہیں بلکہ سارے جسم کے پوروں میں صرایت کر رہی ہو۔ فیض کی شاعری کا رنگ  
لوگ جس بات کو کہتے ہیں اس میں لجھ کی دردناکی اور فضا کی زمی ایک چیز ہے۔  
مجھے اس کی خوشی ہے کہ ان مصراعوں میں وہ رنگ نہیں ہے۔ اچھے اور بدھے شاعر اپنا  
رنگ ضرورت اور موقع کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں گو وہ اپنی فطرت نہیں بدلتے۔

تم نے اپنے گزشتہ خط میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اب انہیں ہمت کر کے  
ایک جست لگانی چاہیے، تا کہ ان کی شاعری میں خوبصوروں اور گل بیزیوں کے علاوہ

خلق خدا کے اس مبارک پیسے اور خون کی حرارت کی آمیزش بھی ہو، جس سے فی الحقیقت زندگی بنتی، بدلتی اور سورتی ہے۔ میں اس خیال سے بالکل متفق ہوں۔ البتہ میں انہیں ایسا کرنے کے لیے وھکا نہیں دینا چاہتا ان امید افزاع علمات کے سبب سے جو حالیہ نظموں اور غزلوں میں خود ہی نظر آ رہی ہیں، جو کہ صحیح جمہوری سمٹ کا پتہ دیتی ہیں۔

میرے خیال میں وہ خود اس نکتہ کو صحیح ہے۔ پنجاب کی سر زمین صدیوں پہلے بابا فرید، وارث شاہ، بیٹھے شاہ کی ذاتوں میں وہ سرے حالات اور وہ سرے ماحول میں ایسی جمہورے شاعری پیدا کر چکی ہے، ہمارے بیان کیسے تسلی، سور ہو چکے ہیں، ایسے نغمے پھر کیوں نہیں چھیڑے جائے۔

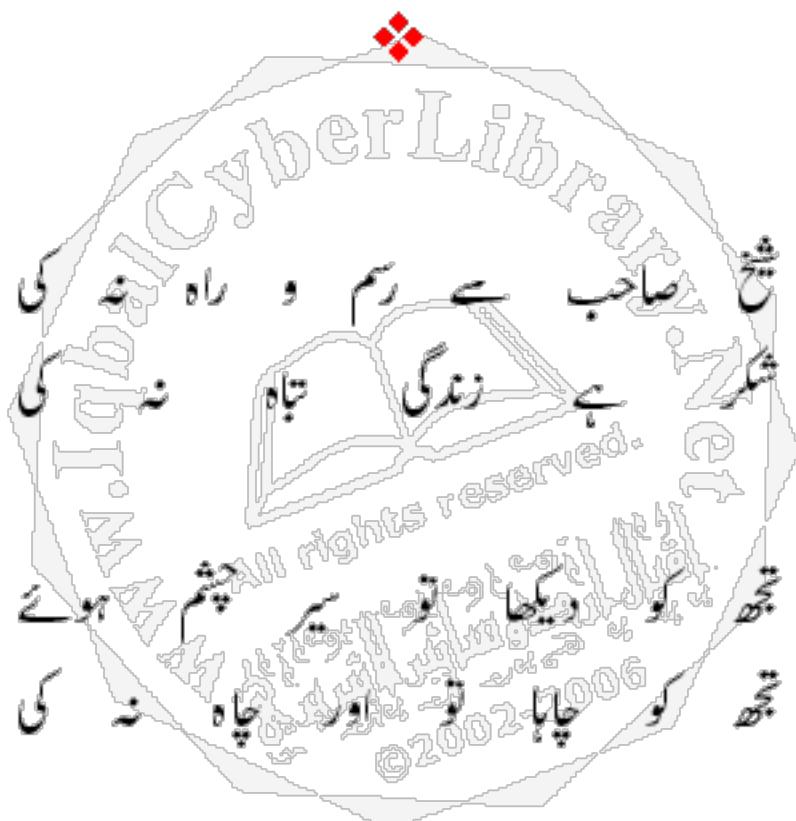
ان نئی غزلوں پر ان کو مبارک باد دینا، گویہ صحیح ہے کہ واد مرزا جعفر علی خان سے ہی لیٹا چاہیے۔ میں تو اب برائے نام لکھنوا کا رہ گیا ہوں۔ چھ سال پنجاب میں اور پنجابیوں کے ساتھ درہ کر اللہ ہی جانتا ہے کہ زبان کتنی بگڑ گئی ہے۔ شاید چونکہ موسم بھار کا ہے۔ اس لیے ہمیں گلوں میں رنگ بھرے بادنو بھار چلے والی غزل سب سے اچھی گلی۔ اس شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب کہی  
تمہارے نام پہ آئیں گے نغمگار چلے  
جس غزل کو تم نے واسوخت کا عنوان دیا ہے وہ بھی اپنے رنگ میں خوب ہے۔  
ایک ایک شعر نثر ہے۔ کس کی تعریف کریں۔ خاص طور پر یہ شعر  
گر فکر زخم کی تو خطاط کار ہیں کہ ہم  
کیوں محو مدح خوبی تبغی ادا نہ تھے  
اس کی دادتو فیض مرزا نوشہ سے بھی لے لیتے۔ جعفر علی خان اثر تو الگ رہے۔

اے ساکنانِ کنج! قفس! صح کو صبا  
ستی ہی جائے گی سونے گزار، کچھ کہوا!

(سودا)





تیرے دست ستم کا عجز نہیں  
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

تھے شب بھر، کام اور بہت  
ہم نے فکر دل تباہ نہ کی

کون قاتل بچا ہے شہر میں فیض  
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی



سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں  
 ہم لوگ سرخو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں  
 شمع نظر، خیال کے انجم، جبر کے داغ  
 جتنے چڑاغ ہیں، ترمی مغلن سے آئے ہیں

اٹھ کر تو ۲ گئے ہیں تری بزم سے مگر  
 کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی  
 ہم گھوم پھر کے کوچہ قاتل سے آئے ہیں

باد خزاں کا شکر کرو، فیض، جس کے ہاتھ  
 نامے کسی بہار شامل سے آئے ہیں

جیب غبر دست!

Cyber Library

ایک اخنی خاتون کے نام

خوبصورت اخنی خاتون ہونے پر

کسی بکرے دستِ عنايت نے مج زندگان میں

کیا ہے مج عجب بول نواز بندو بست

چک رہی ہے فضا زلف یار کی صورت

ہوا ہے گرمی خوبصورت سے اس طرح سرست

ابھی ابھی کوئی گزارا ہے گل بدن گویا

کہیں قریب سے، گیسو بدوش، غنچہ بدست

لیے ہے بونے رفاقت اگر ہوانے چمن

تو لاکھ پھرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پست

ہمیشہ بزر رہے گی وہ شاخ مهر و وفا

کہ جس کے ساتھی بندھی ہے دلوں کی لفت و شکست

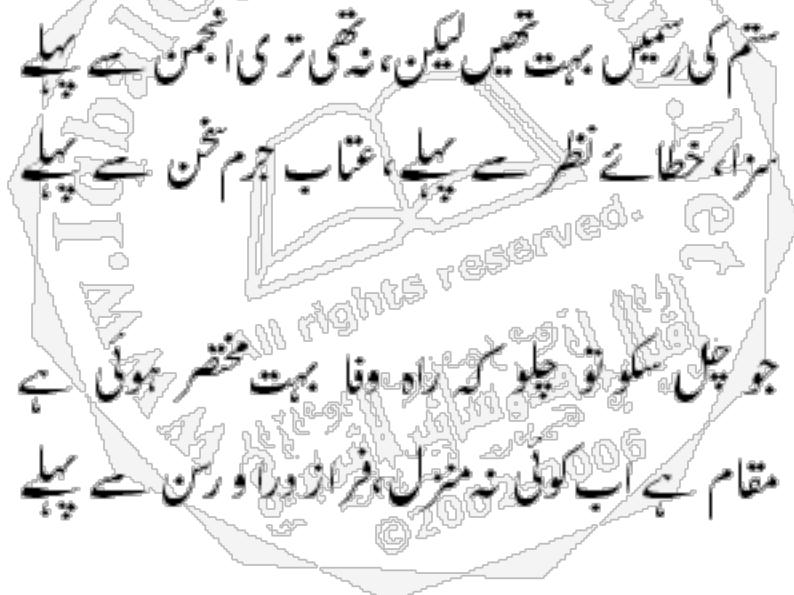
یہ شعر حافظ شیراز، اے صبا! کہنا

ملے جو تجھ سے کہیں وہ جیب غبر دست

خلل پذیر بود ہر بنا کے مے بینی

بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است  
سنٹرل جیل حیدر آباد





نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجراہ داری  
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خردپو و یوانہ بن سے پہلے

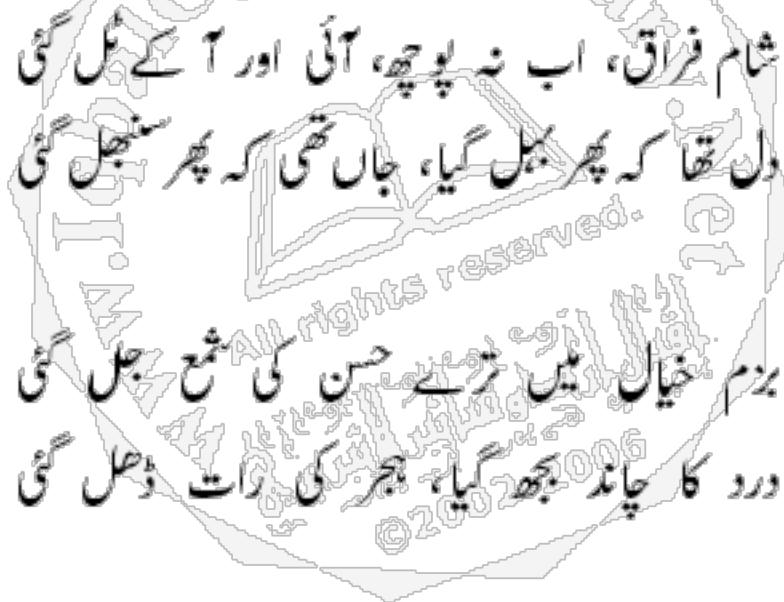
کرے کوئی تیغ کا نظارا، اب ان کو یہ بھی نہیں گوا را  
بعضد ہے قاتل کہ جان بکل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

غور سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے  
جو خار و خس والی چمن تھے عروج سرو و سمن سے پہلے

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے درد دل ہے  
زیاں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیرو ذکر وطن سے پہلے  
**حیدر آباد جیل**

مئذنی ۱۴۲۷، می ۱۳۹۵





جب تجھے یاد کر لیا، صح مہک اٹھی  
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم  
کہنے میں ان کے سامنے بات بدلتی گئی

آخر شب کے ہم سفر فیض نجانے کیا ہوئے  
رہ گئی کس جگہ صبا، صح کدھر نکل گئی

جناب ہسپتال کراچی

جولائی ۱۹۵۳ء





نہیں شکایت بھرا کہ اس ویلے سے  
ہم ان سے رشتہ دل استوار کرتے رہے

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہ انتظار نہ تھی  
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

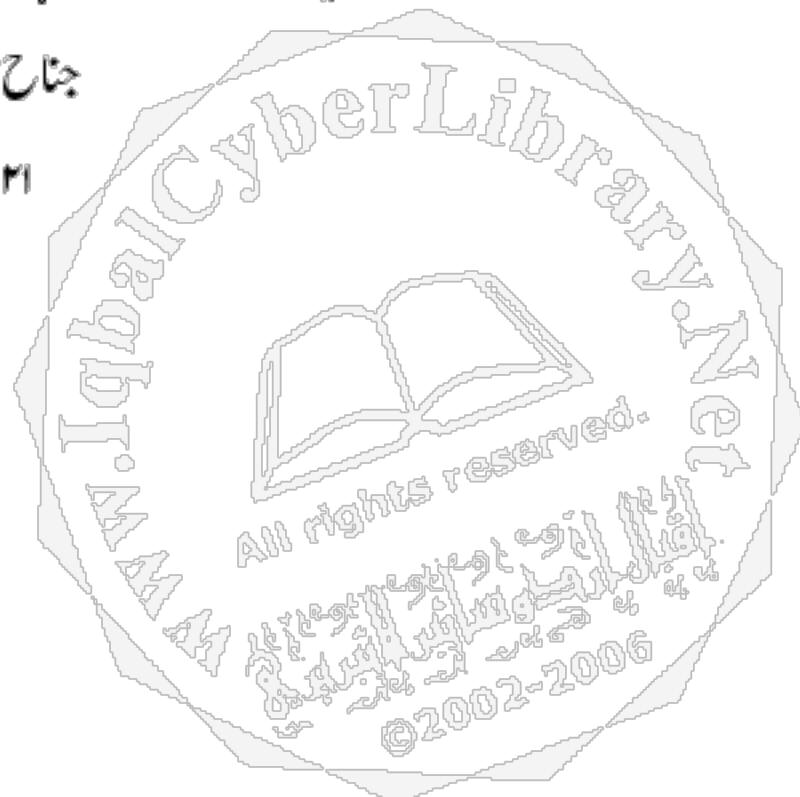
ہم اپنے راز پہ نازاں تھے، شرمدار نہ تھے  
ہر ایک سے خن رازدار کرتے رہے

ضیائے بزم جہاں بار بار ماند ہوئی  
حدیث شعلہ رخاں بار بار کرتے رہے

انہیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے  
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

جناح ہسپتال کراچی

۵۳، اگست، ۲۱



## ملاقات

اس درد کا شجر ہے  
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے  
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں  
میں باہم مشعل بکف  
کے کارواں، گھر کے کھوکھو گئے ہیں  
ہزار مہتاب، اس کے سامنے  
میں اپنا سب نور رون گئے ہیں  
یہ رات اس درد کا شجر ہے  
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے  
مگر اسی رات کے شجر سے  
یہ چند لمحوں کے زرد پتے  
گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں  
الجھ کے گنار ہو گئے ہیں  
اسی کی شبِ نیم سے خامشی کے  
یہ چند قطرے، تری جبیں پر  
برس کے، ہیرے پو گئے ہیں



وہ غم جو اس وقت تیری باہوں  
کے گلستان میں سُلگ رہا ہے  
(وہ غم، جو اس رات کا شر ہے)  
کچھ اور تب جائے اپنی آہوں  
کی آنج میں تو یہی شر ہے

ہر اک یہ شاخ کی کماں سے  
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے  
جگر سے نوچے ہیں، اور ہر اک  
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

(۳)



شفق کا گزار بن گئے ہیں  
یہیں پر قاتل دکھوں کے تیشے  
قطار اندر قطار کرنوں  
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں  
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے  
یہ غم سحر کا یقین بنا ہے  
یقین جو غم سے کریم تر ہے  
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

ملکبری جیل

۱۱۲، ۳، نومبر ۵۳، ۲۰۱۴ء

نہ آج لطف کر اتنا کہ گل گزرنے کے  
وہ رات جو کہ ترے گیسوں کی رات نہیں  
یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہم  
وصال بیان نقطہ آرزو کی بات نہیں

All rights reserved.  
© 2002-2006



اشک خونا ب ہو چلے ہیں  
غم کی رنگت بدلت چلی ہے

یا یونہی بجھ رائی ہیں شمعیں  
یا شب بھر ٹل چلی ہے

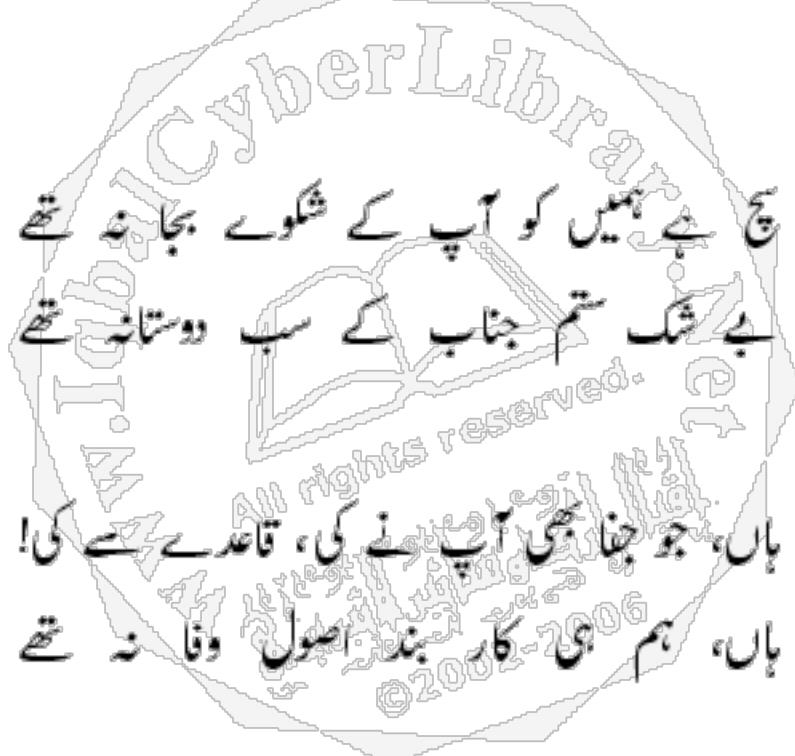
لاکھ پیغام ہو گئے ہیں  
جب صبا ایک پل چلی ہے

جاوے اب سو روہ ستارو  
ورو کی رات ڈھل چلی ہے

**ملک مری جیل**



واسوخت



آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں  
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

کیوں داد غم، ہمیں نے طلب کی، برا کیا  
ہم سے جہاں میں گشۂ غم اور کیا نہ تھے

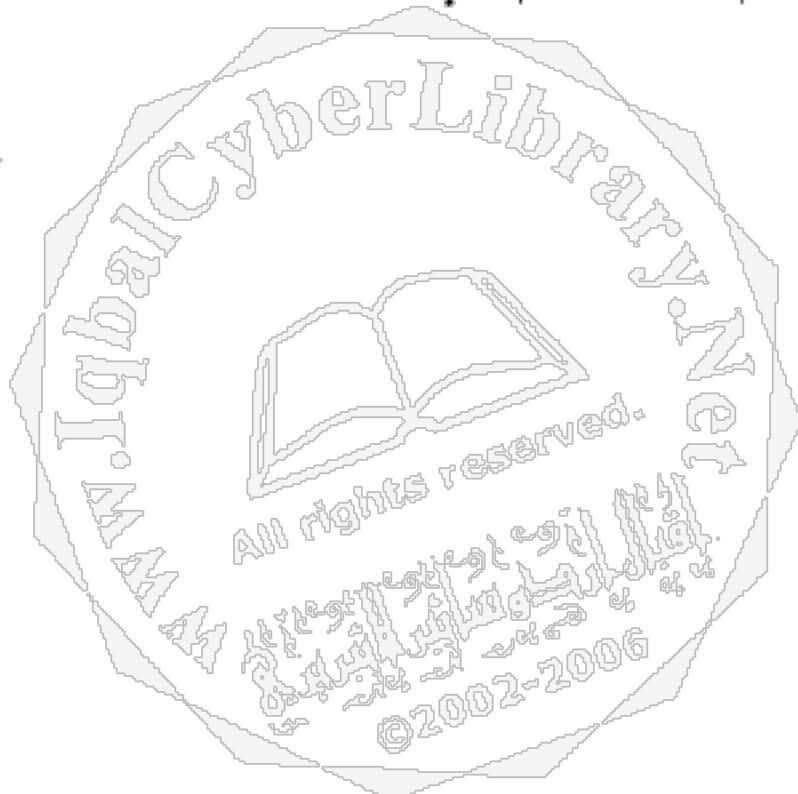
گر فکر زخم کی تو خطا وار ہیں کہ ہم  
کیوں محو مدح خوبی تنقیح ادا نہ تھے

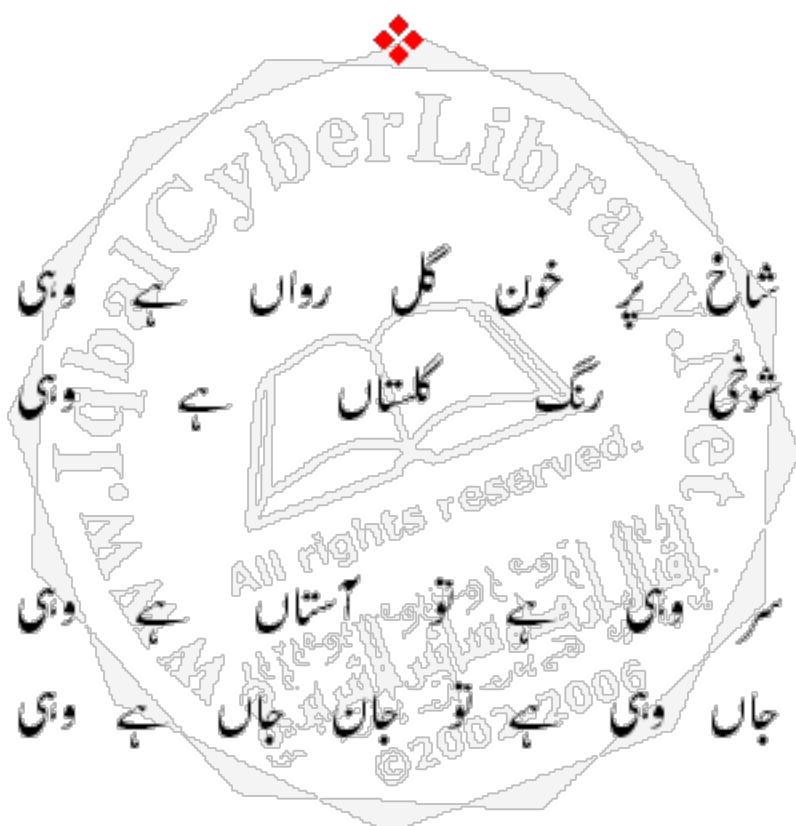
ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گرینے تھا  
ورنہ ہمیں جو دکھ تھا، بہت لا دوانہ نہ تھے

لب پر ہے تلخیء مے لایم، ورنہ فیض  
ہم تلخیء کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

ملکمری جیل،

۵۳ نومبر ۲۲





اب جہاں مہرباں نہیں کوئی  
کوچھ یار مہرباں ہے وہی

برق سو بار گر کے خاک ہوئی  
رونق خاک آشیاں ہے وہی

آج کی شب وصال کی شب ہے  
دل سے ہر روز داستان ہے وہی

چاند تارے ادھر نہیں آتے  
ورنہ زندگی میں آسمان ہے وہی

**ملکمری جیل**

مكتبة إلكترونية



کب یاد میں تیر اساتھ نہیں، کب ہات میں تیر اہات نہیں  
 صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب بھرگی کوئی رات نہیں  
 مشکل ہیں اگر حالات وہاں ہوں جج آئیں جاں دے آئیں  
 دل والوں کو چھڑ جانیں یہیں کیا رہیے بھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقل میں گیا، وہ شانِ سلامت رہتی ہے  
 یہ جان تو آئی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں  
 عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا  
 گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

ملگری جیل



دل مدی کے حرف ملامت سے شاد ہے  
اے جان جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

دل نا امید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے  
لبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

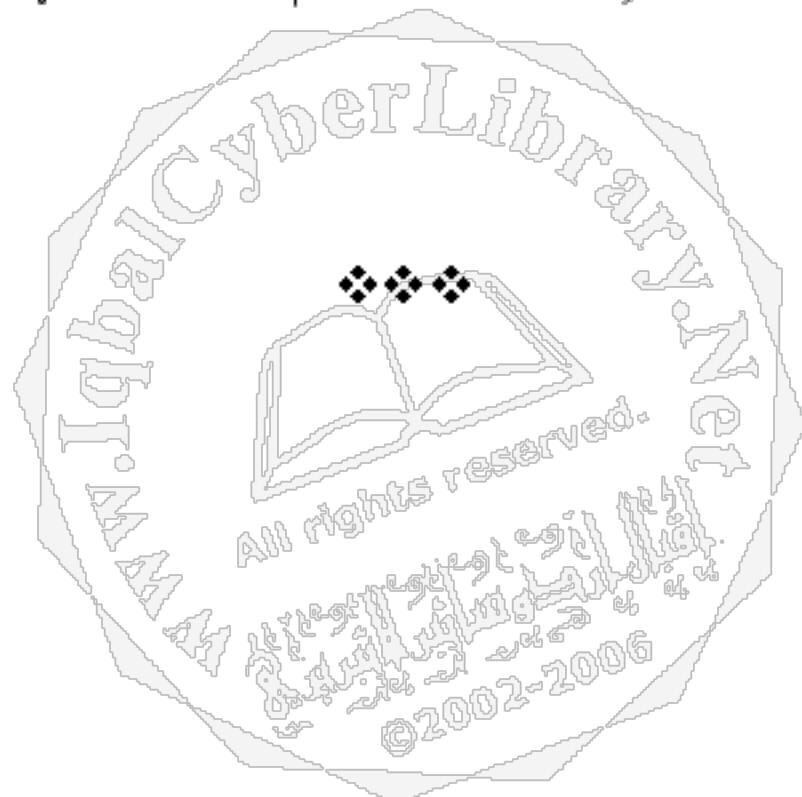
دست نلک میں گردش تقدیر تو نہیں  
دست نلک میں گردش ایام ہی تو ہے

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا  
وہ یار خوش خصال سر بام ہی تو ہے

بھی ہے رات فیضِ غزل ابتدا کرو  
وقت سرودہ درد کا ہنگام ہی تو ہے

ملکمری جیل

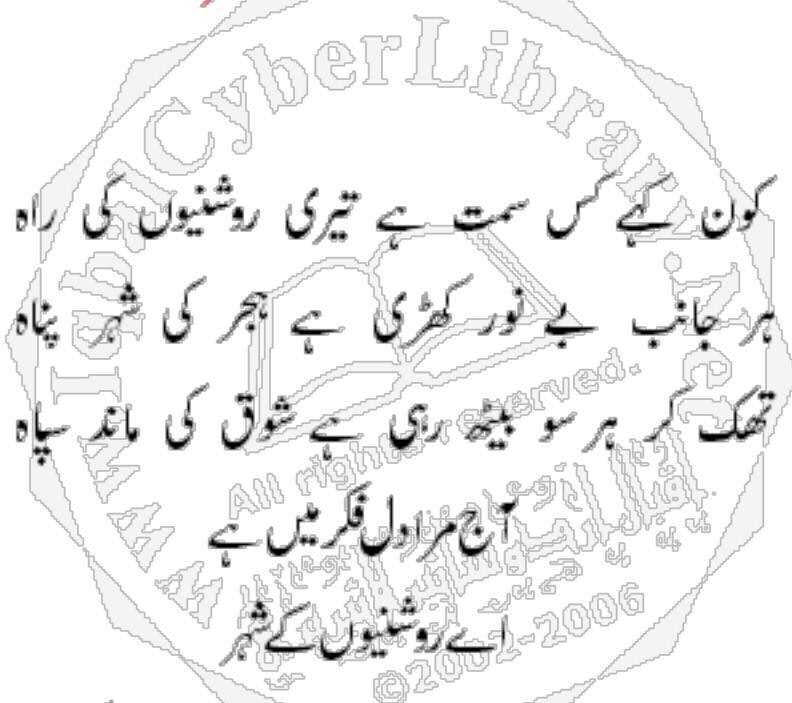
۱۹ مارچ ۲۰۰۵ء



# اے روشنیوں کے شہر

بزرہ بزرہ، سوکھ رہی ہے پھیک، زرد ووپہر  
دیواروں کو چاث رہا ہے تھائی کا زہر  
دورانق میک حقی ہی حقی، اخشی، اگر قی رہق ہے  
کہر کی صورت ہے رونق دردوں کی گدالی اہر  
بستا ہے اس کہم کے پیچھے روشنیوں کا شہر

## اے روشنیوں کے شہر

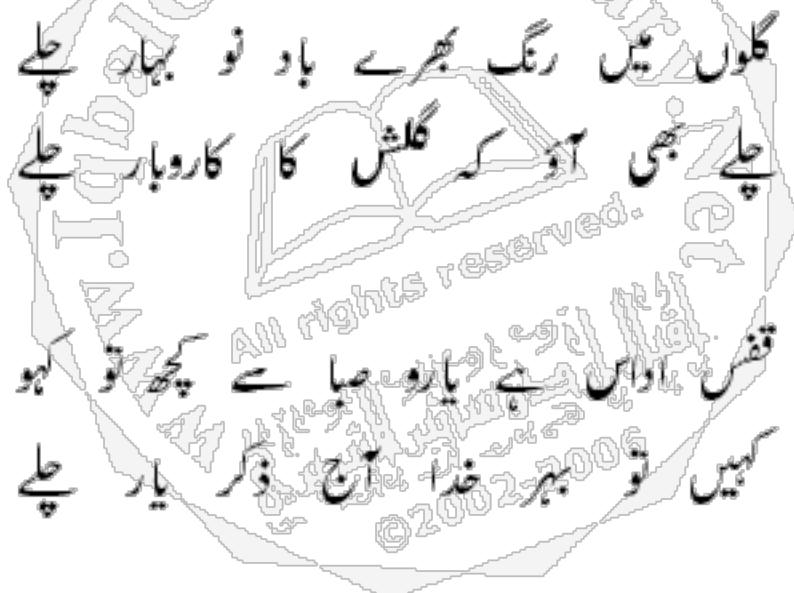


شب خون سے منہ پھیرنے جانے ارماؤں کی رو  
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو  
آج کی شب جب دیئے جلائیں، اوپنجی رکھیں لو

lahorejil ۲۸ مارچ

ملگری جیل - ۱۵ اپریل ۲۰۰۶ء





کبھی تو صح تے کنج لب سے ہو آغاز  
کبھی تو شب سر کا کاکل سے مشکار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب کہی  
تمہارے نام پر آئیں گے نغمگار چلے

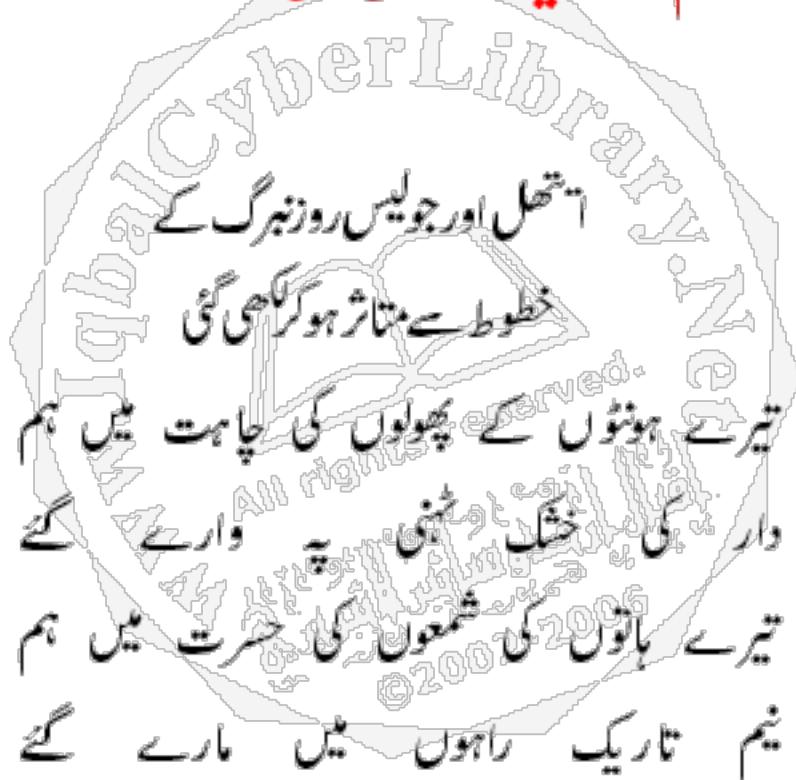
جو ہم پر گزری سو گزری مگر شب ہجران  
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضور یار ہوئی دفتر جنوں کی طلب  
گرہ میں لے کے گریبان کا تار تار چلے

مقام، فیض، کوئی راہ میں بچا ہی نہیں  
جو کوئے یار سے نکلے تو سونے دار چلے



ہم جو تاریک را ہوں میں مارے گے



سویں پر ہمارے بیوں سے پے  
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی  
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی  
تیرے ہاتھوں کی چاندی دکتی رہی

جب گھلی تیری را ہوں میں شام ستم  
ہم پے آئے، لائے جہاں تک قدم  
لب پڑھ فر غزل، دل میں قدیل غم  
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی  
دیکھ قائم رہے اس گواہی پر ہم  
ہم جو تاریک را ہوں میں مارے گے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی،  
 تیری الفت تو اپنی ہی مذیدر تھی  
 کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے  
 بحر کی قتل گاہوں سے ب جا ملے  
 قتل گاہوں سے چین کر ہمارے علم  
 اور نکیں گے عشق کے قافی  
 جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم  
 مختصر کے چلے درد کے فاصلے

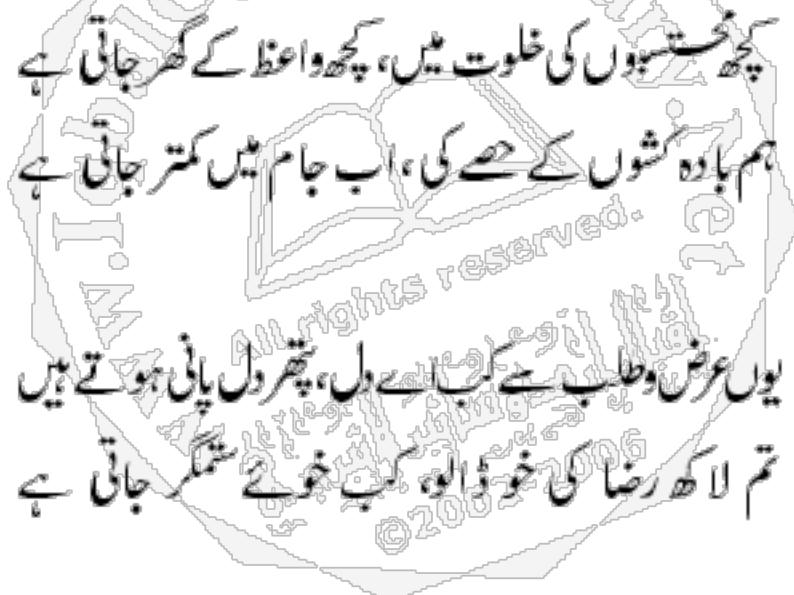
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم  
 جاں گنو کر تری طبری کا بھرم  
 ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

**ملک مری جیل**

**۱۵۲۱ءی**







بیدا و گروں کی بستی ہے یاں داد کہاں خیرات کہاں  
سر پھوٹتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے

ہاں، جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا سمجھے  
ہر رہ جواہر کو جاتی ہے، مقل سے گزر کر جاتی ہے

اب کو چہہ لبر کا رہرو، رہن بنی بھی بنے تو بات بنے  
پھرے سے عدو ٹلتے ہی نہیں اور رات برادر جاتی ہے

ہم اہل نفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نئیں صبح وطن  
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

**شمسی جیل**



گلائی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں  
 ہر ایک اپنے مسیح کے خون کا رنگ لیے  
 ہر ایک وصل خداونم کی امنگ لیے

All rights reserved.  
Digitized by srujanika@gmail.com

کسی پر کروتے ہیں اپنے بیمار کو قرباں  
 کسی پر قتل مہ تابناک کرتے ہیں  
 کسی پر ہوتی ہے سرمت شاخسار دو نیم  
 کسی پر باد صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوندگان مہرو جمال  
 اپھو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں  
 اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے  
 شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

ملکمری جیل

دسمبر ۱۹۵۳ء



## درد آئے گا دبے پاؤں

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تہاں دل کو  
فلک لے گی کہ تہائی کا کیا چارہ کرے  
درد آئے گا دبے پاؤں، لے سرخ چڑاغ  
وہ جو اگ رہا درست تاہے کہیں دل ہے پرے  
شعلہ درد جو پہلو میں لپک اٹھے گا  
دل کی دیوار پر ہر نقش دک اٹھے گا

حلقہ زلف کہیں، گوشہ رخسار کہیں  
بھر کا دشت کہیں، گلشن دیدار کہیں  
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں



دل سے پھر ہو گی مرے بات کے دل اے دل  
یہ جو محبوب بننا ہے تریٰ تنہائی کا  
یہ تو مہماں ہے گھری بھر کا، چلا جائے کا  
اس سے کب طیاری مصیت کا مداوا ہو گا  
مشتعل ہو کے ابھی انھیں گھر و حشیہ سائے  
یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے

رات بھر جن سے ترا خون خرابا ہو گا  
جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل  
دشم جاں ہیں بھی، سارے کے سارے قاتل  
یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی  
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل  
لاو، سلاکاً کوئی جوش غضب کا انگار  
طیش کی آتش جرار کہاں ہے لاو  
وہ دمکتا ہوا گلزار کہاں ہے لاو  
جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، تو انائی بھی

ہونہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لہر  
منتظر ہو گا اندھیرے کی فصیلوں کے اہر

ان کو شعلوں کے رجن اپنا پتا تو دیں گے  
خیر، ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدات تو دیں گے  
وور کنٹی ہے ابھی صح، بتا تو دیں گے  
شکری جل  
کیم دسمبر ۲۰۰۵ء





# AFRICA COME BACK



آ جاؤ، میں نے ڈھول سے ماتھا اٹھا لیا  
 آ جاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال  
 آ جاؤ، میں نے ورد سے بازو چھڑا لیا  
 آ جاؤ، میں نے نوج دیا بے کسی کا جال  
 "آ جاؤ جاؤ جاؤ جاؤ" ایفریقا

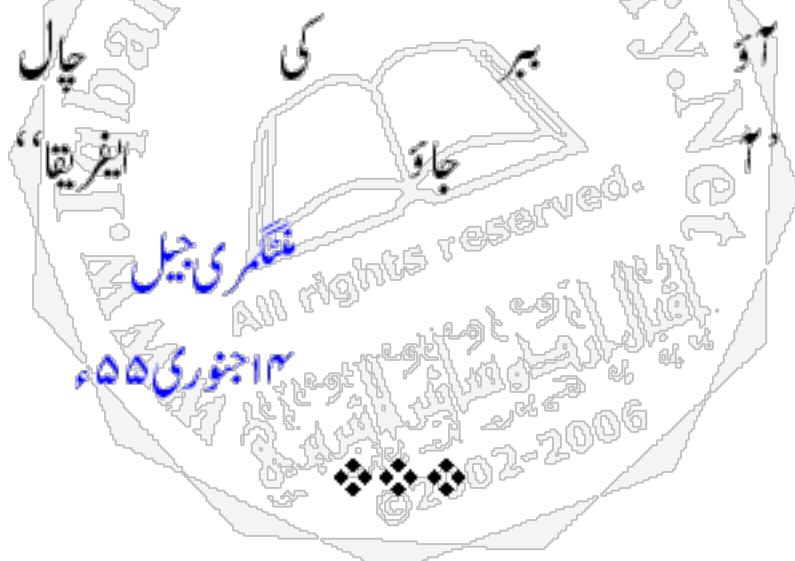
پنجے میں ہتھڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز  
 گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال  
 "آ جاؤ جاؤ جاؤ جاؤ" ایفریقا

افریقہ حریت پسندوں کا نصرہ

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین  
 دشمن ابھو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال  
 "آ جاؤ جاؤ جاؤ جاؤ" ایفریقا

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا

دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال  
میں ایفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ  
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری بیر کی چال  
جاؤ ایفریقا“





وہ تو وہ ہے، تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے  
 اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

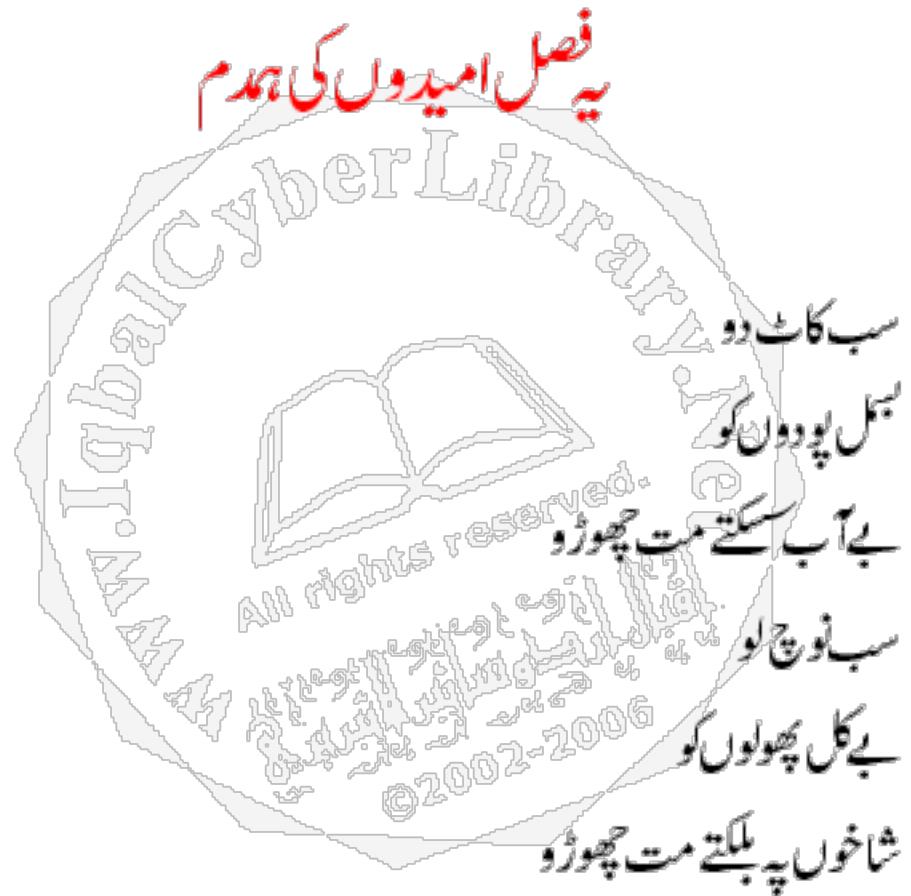
وہ جواب چاک گریاں بھی نہیں کرتے ہیں  
 دیکھنے والو کبھی ان کا جگر تو دیکھو

دامن درد کو گزار بنا رکھا ہے  
 آؤ اک دن دل پر خون کا ہنر تو دیکھو

صح کی طرح جھمکتا ہے شب غم کا افق  
 فیض، تابندگی دیدہ تر تو دیکھو

**ملکمری جیل**





یہ فصل امیدوں کی ہدم  
اس بار بھی فارت جائے گی  
سب مخت، صحون شاموں کی  
اب کے بھی اکارت جائے گی  
سکھیتی کے کونوں، کھدروں میں  
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو  
پھر مٹی سینچو اشکوں سے  
پھر اگلی رت کی فکر کرو

پھر اگلی رت کی فکر کرو  
جب پھر اک بار اجزنا ہے  
اک فصل پکی تو بھر پایا

جب تک تو یہی کچھ کنا ہے  
شکری جیل



بنیاد پچھوڑو ہو

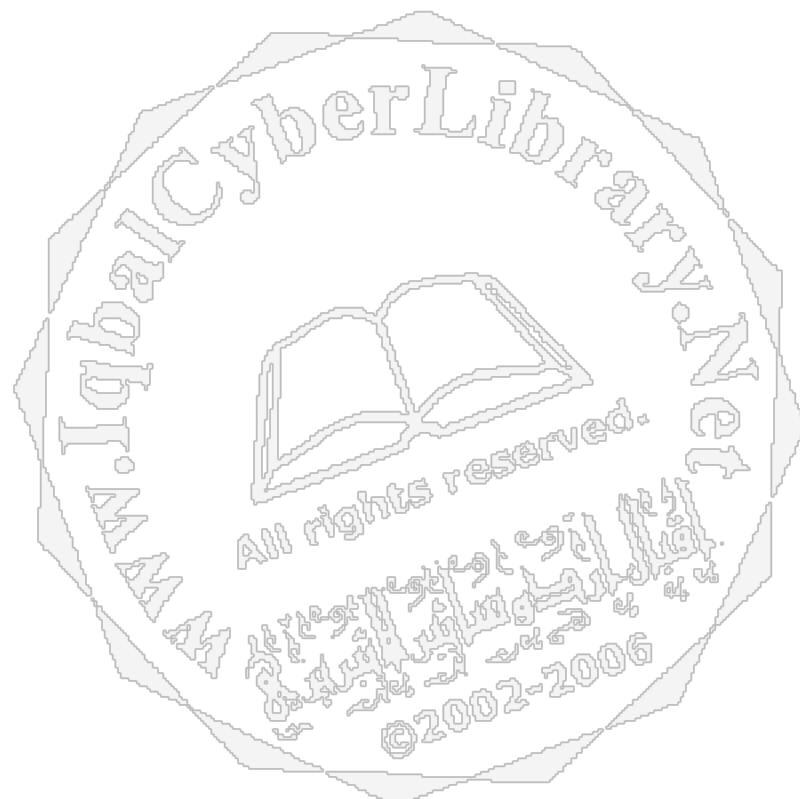


مرنے پلے تو سطوت قاتل کا خوف کیا  
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا  
مقمل میں کچھ تو رنگ جسے جشن رقص کا  
رنگیں اپو سے نچھے صیاد کچھ تو ہو

خون پر گواہ دامن جلاو کچھ تو ہو  
جب خون بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو  
گرتن نہیں، زبان کہی، آزاد کچھ تو ہو  
وشنام، نالہ، ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو  
چینے ہے درو، اے دل بریاد کچھ تو ہو  
بولو کہ شور حشر کی ایجاد کچھ تو ہو  
بولو کہ روز عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

ملکمری جیل

۱۳، اپریل ۱۴۵۵ء



# کوئی عاشق کسی محبوبے!

یاد کی رہا گزر جس پر اسی صورت کے  
مدعیں بیت گئی ہیں تمہیں چلے چلتے  
ختم ہو جائے جو دو چار سارے قدم اور چلو  
موڑ پر تالہ ہے جہاں دشت فراموشی کا  
جس سے اُنگے نہ کوئی میں ہوں نہ کوئی تم ہو  
سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم  
تم پٹ آؤ، گزر جاؤ، یا مژ کر دیکھو

گرچہ واقف ہیں نگاہیں کہ یہ سب دھوکا ہے  
گر کہیں تم سے ہم آغوش ہوئی پھر سے نظر  
پھوٹ نکلے گی وہاں اور کوئی راہ گزر  
پھر اسی طرح جہاں ہو گا مقابل پیام  
سایہ زلف کا اور جنبش بازو کا سفر

دوسری بات بھی جھوٹی ہے کہ دل جانتا ہے  
یاں کوئی موڑ کوئی دشت کوئی گھات نہیں  
جس کے پردے میں مرا ماہ رواں ڈوب سکے  
تم سے چلتی رہے یہ راہ، یونہی اچھا ہے

تم نے مذکر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں



اگست ۱۹۵۵ء

شہر میں چاک گریاں ہوئے ناپید اب کے  
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے  
لطف کرے نگہ یارہ کہ غم والوں نے  
چاند دیکھا تری گنجوں میں ہنخ ہونوں پر شفقت  
ماق جلتی ہے شب غم سے تری دید اب کے

دل دکھا ہے نہ وہ پہلا سا نہ جاں تری ہے  
ہم ہی غافل تھے کہ آئی ہی نہیں عید اب کے  
پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی  
لا کے رکھو سر محفل کوئی خورشید اب کے

کراچی، ۱۲ اگست ۱۹۵۵ء





ہوں مطرب و ساقی میں پریشان اکثر  
اپ آتا ہے کبھی ماہ تمام آتا ہے

شووق والوں کی حزیں محفل شب میں اب بھی  
آمد صح کی صورت ترا نام آتا ہے

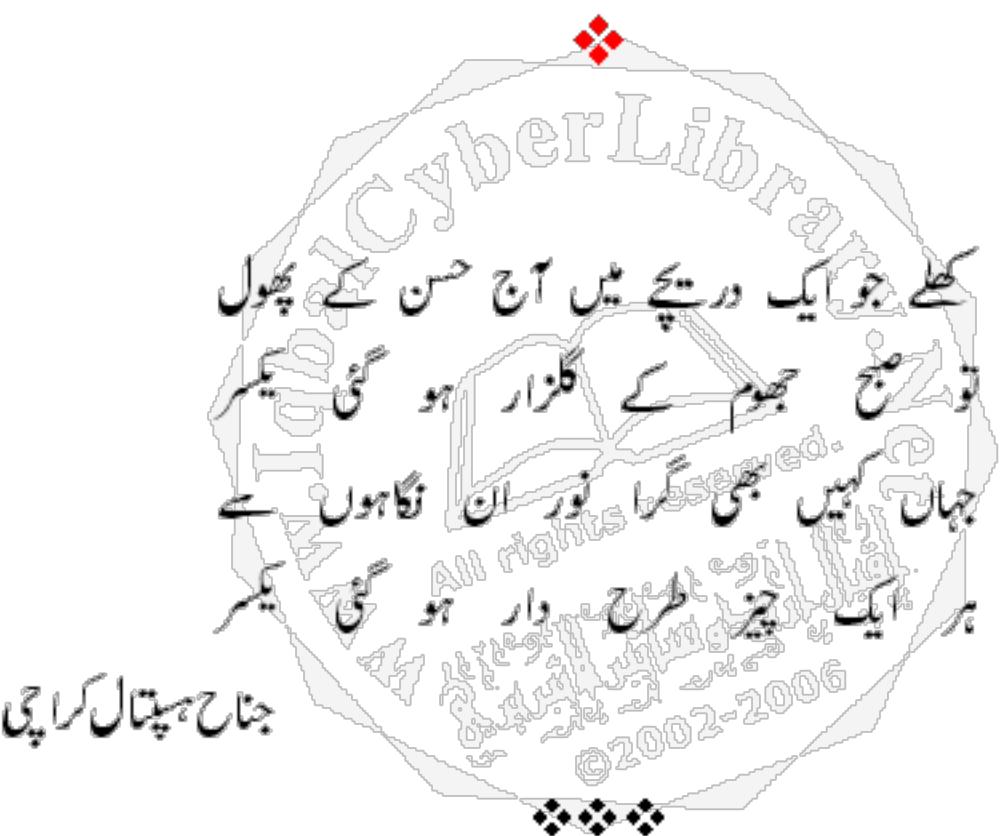
اب بھی اعلان سحر کتا ہوا مست کوئی  
داغ دل کر کے فروزان سر شام آتا ہے  
**ناتمام**

لاہور مارچ ۲۰۱۴ء

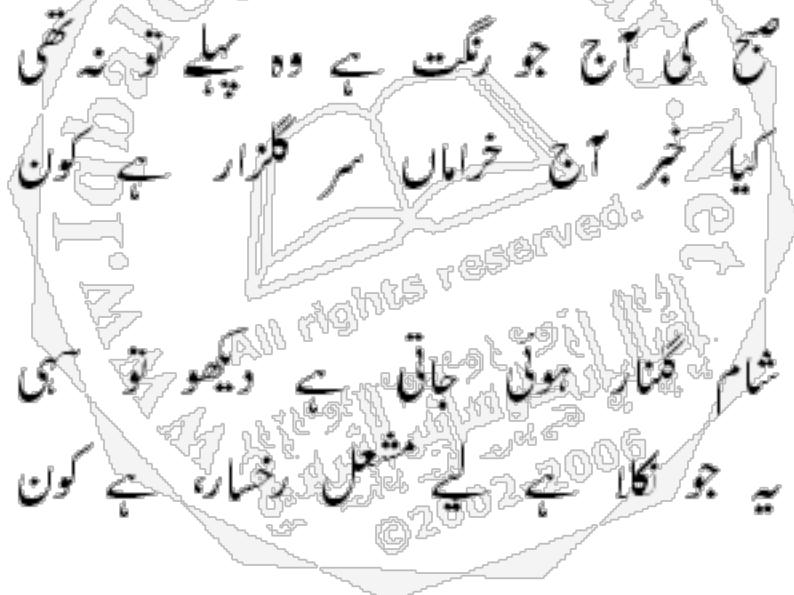








جناب ہپتال کراچی

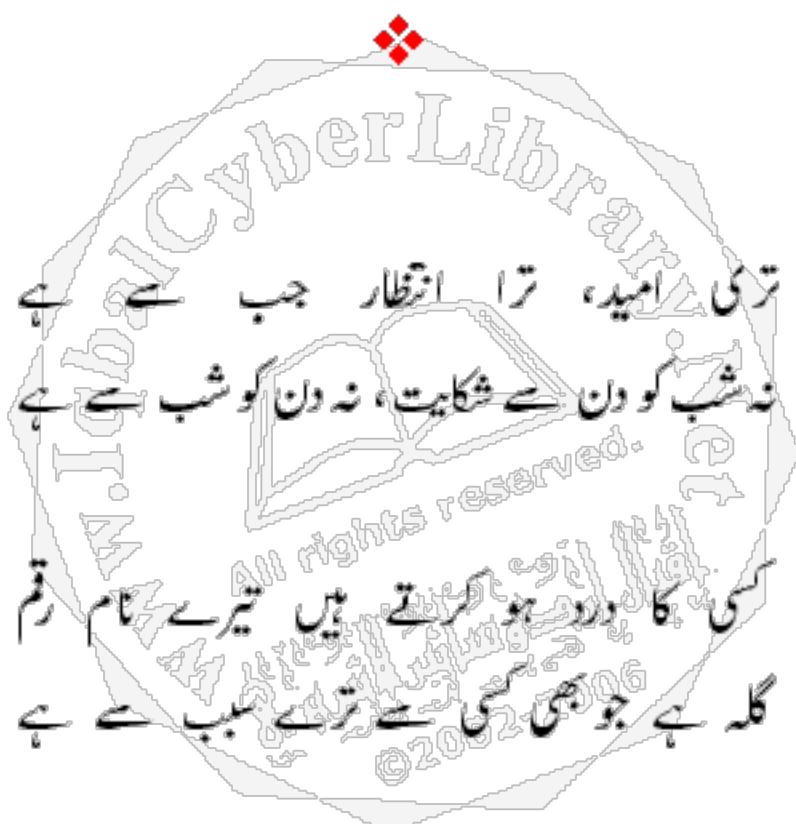


رات مہکی ہوئی آئی ہے کہیں سے پوچھو  
آج بکھراتے ہوئے زلف طرح دار ہے کون

پھر در دل پے کوئی دینے لگا ہے دستک  
جانئے پھر دل وحشی کا طلب گار ہے کون  
جناب ہسپتال کراچی

جو لالی، ۵۳





ہوا ہے جب سے دل ناصور ہے قابو  
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے  
طرح طرح کی طلب، تیرے رنگ لب سے ہے

کہاں گئے شب فرقت کے جانے والے  
ستارہ سحری ہم کلام کب سے ہے

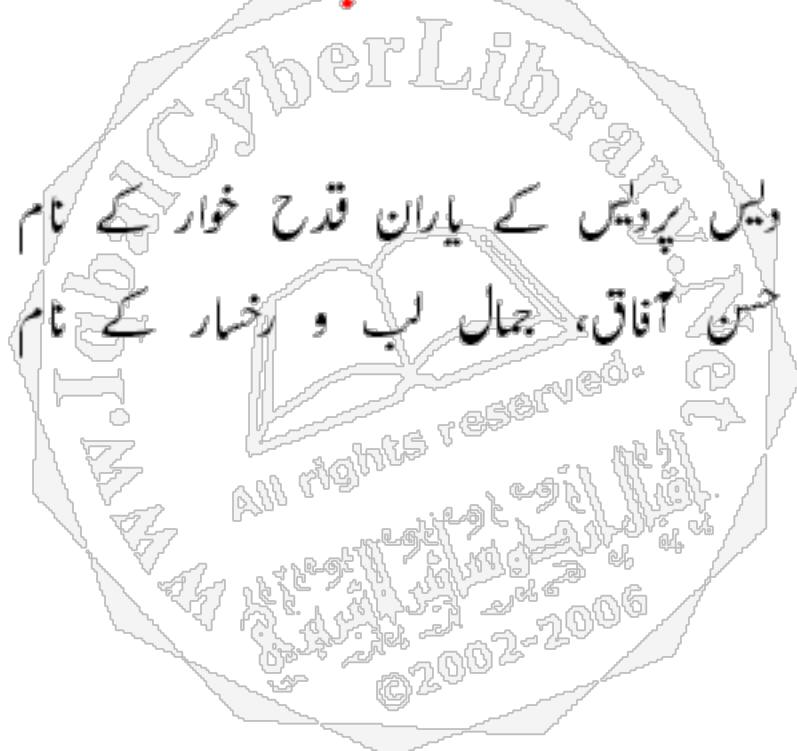
لا ہور مارچ ۲۰۱۴ء







انشتاب

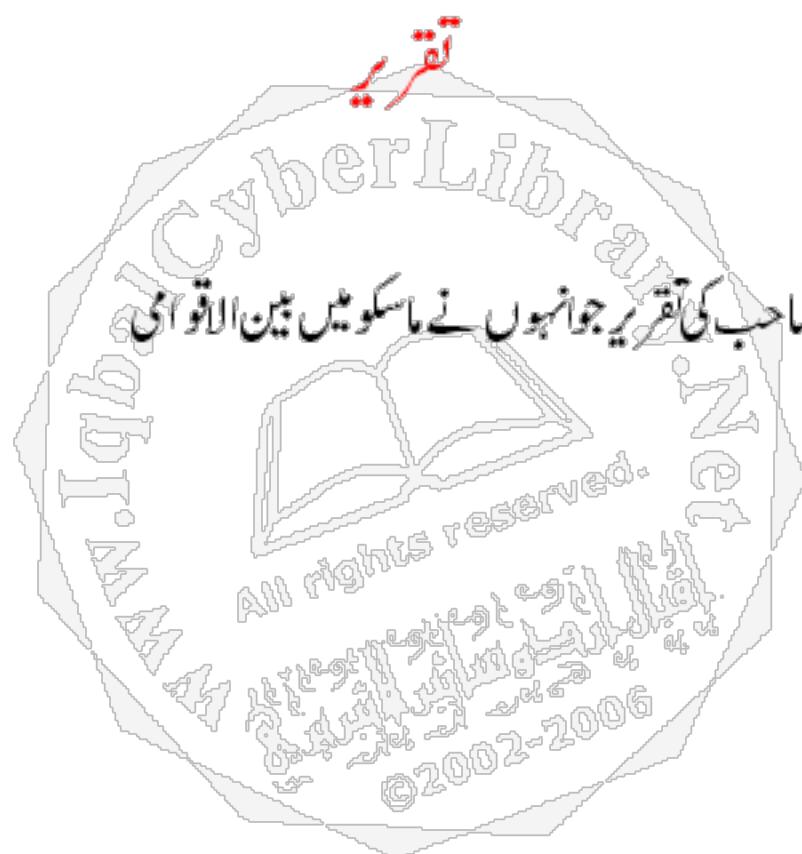


سر آغاز

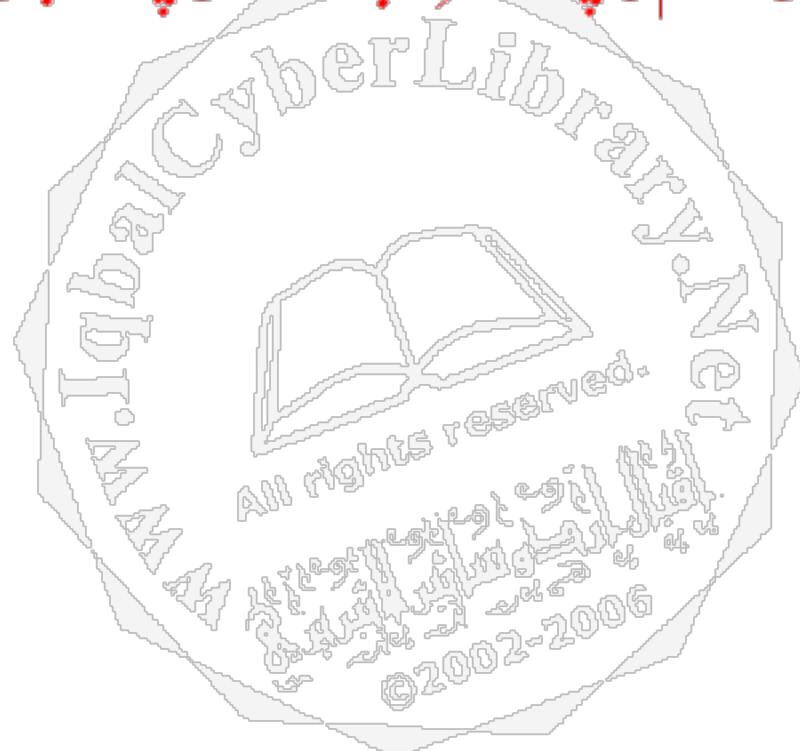
Cyber Library

شاید بھی افشا ہو، نگاہوں پر تمہاری  
ہر سادہ ورق، جس سخن کشہ سے خون ہے  
شاید بھی اس لیت کا پرچم ہو سر افزار  
جو آمد صراحت کی تمنا میں گنوں ہے  
شاید بھی اس دل کی گولی رنگ بیٹیں چھڑ جائے  
جو سنگ سر راہ کی مانند زبoul ہے





لینن امن انعام کی پر شکوہ تقریب کے موقع پر اردو بان میں کی



# محترم ارکین مجلس صدارت، خواتین اور حضرات!

الفاظ کی تخلیق و ترتیب شاعر اور ادیب کا پیشہ ہے لیکن زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب یہ قدرت کلام جواب دے جاتی ہے۔ آج جمعری بیان کا ایسا ہی مرحلہ مجھے درپیش ہے۔ ایسے کوئی الفاظ میرے ذہن میں نہیں آ رہے، جن میں اپنی عزت افرادی کے لیے یعنی پر اخلاقی، سوویٹ یونین کے مختلف اداروں، دوستوں اور سب خواتین اور حضرات کا شکریہ خاطر خواہ طور سے ادا کر سکوں۔ لیفن اُن انعام کی عظمت تو اسی ایک بات سے واضح ہے کہ اس سے لیفن کا محترم نام اور مقدس لفظ وابستہ ہے۔ لیفن جو دو راحتر میں انسانی حریت کا سب سے بزرگ علم بردار ہے اور اُن جوانانی زندگی اور اس زندگی کے حسن و خوبی کی شرط اول ہے۔ مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی کام نظر نہیں آتا جو اس عظیم اعزاز کے شایان شان ہو۔ لیکن اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنا اور آ درش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کو واپسی رہی ہے یعنی اُن اور آزادی کی تمنا وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے سے ان کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزت اور اکرام کے مستحق ٹھہر تے ہیں۔

یوں تو ڈنی طور سے مجرموں اور جرام پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ اُن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیز ہے اور سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ اُن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، وہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کے موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی خاصی اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شور

اور فہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری اس لیے بظاہر اُس اور آزادی کے حصول اور تحریک کے متعلق ہوشمندان انہوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیے لیکن بدلتی سے یوں نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتداء سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں مختلف دعوایں اور قوتیں برسر عمل اور برسر پیکار ہی ہیں۔ یہ قوتیں ہیں تحریک و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف و وقی اور انصاف و شمنی کی قوتیں یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کتمکش آج بھی جاری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گزشتہ دور کی انسانی ابحوثوں میں کئی نو تقویوں سے بھی فرق ہے۔ یورپی حاضر میں جنگ سے وقبیلوں کا باہمی خون خراپہ مراد نہیں ہے نہ آج کل امن سے خون خراپی کا خاتمه مراد ہے۔ آج کل جنگ اور اُس کے معنی ہیں اُس آدم کی بقا اور فنا، بقا اور فنا ان دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دار و مدار ہے۔ انہیں پر انسانوں کی سرزی میں کی آبادی اور بر بادی کا انحصار ہے۔ یہ پہلا فرق یہ ہے کہ اب سے پہلے انسانوں کو فطرت کے ذخائر پر اتنی دسترس اور پیدوار کے ذرائع پر اتنی قدرت نہ تھی کہ ہر گروہ اور برادری کی ضرورتیں پوری طرح سے تسلیم پاسکیں اس لیے آپس میں چھین جھپٹ اور لوٹ مار کا کچھ نہ کچھ جواز بھی موجود ہے، لیکن اب یہ صورت نہیں انسانی عقل سائنس اور صنعت کی بدولت اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ جس میں سب تن بخوبی پل سکتے ہیں اور سبھی جھولیاں بھر سکتی ہیں۔ بشرطیکہ قدرت کے یہ ہے بہاذ خائز پیدوار کے یہ ہے اندازہ خرمن، بعض اجادوں اور مخصوص طبقوں کی تسلیم ہوں کے لیے نہیں، بلکہ جمعلہ انسانوں کی بہبود کے لیے کام میں لائے جائیں۔ اور عقل اور سائنس اور صنعت کی کل ایجادیں اور صلاحیتیں تحریک کے بجائے تعمیری منصوبوں میں صرف ہوں۔ لیکن یہ جب بھی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی معاشرے کے ظاہری کی بنائیں ہوں، استھصال اور

اجارہ داری کے بجائے انصاف، برادری، آزادی اور اجتماعی خوش حالی میں اٹھائی جائیں۔ اب یہ ذہنی اور خیالی بات نہیں عملی کام ہے اس عمل میں امن کی جدوجہد اور آزادی کی حد میں آپس میں مل جاتی ہیں۔ اس لیے کہ امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ، ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں۔ ایک طرف وہ سامراجی قوتیں ہیں جن کے مقابلہ میں اجراء کے اجراء جن کے بغير قائم نہیں رہ سکتے اور جنہیں ان اجراءوں کے تحفظ کے لیے پوری انسانیت کی بھیث بھی قبول ہے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں جنہیں بنکوں اور کمپنیوں کی نسبت انسانوں کی جان زیادہ عزیز ہیں۔ جنہیں دوسروں پر حکم چلانے کے بجائے آپس میں ہاتھ بٹانے اور ساتھ مل کر گام کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ سیاست و اخلاق، ادب اور فن روزمردہ کی زندگی غرض کی محاذوں پر کئی صورتوں میں تعمیر اور تحریک انسان دوستی اور انسان دشمنی کی یہ چیقلش جاری ہے۔ آزادی پسند اور امن پسند لوگوں کے لئے ان میں سے ہر محاذا اور ہر صورت پر توجہ دینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر سامراجی اور غیر سامراجی قوتوں کی لازمی کشمکش کے علاوہ بد قسمتی سے بعض ایسے ممالک بھی شدید اختلافات موجود ہیں جنہیں حال ہی میں آزادی ملی ہے۔ ایسے اختلافات ہمارے پاکستان اور ہمارے سب سے نہ سایہ ہندوستان میں موجود ہیں۔ بعض عرب ہمایہ ممالک میں اور بعض افریقی حکومتوں میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے اختلافات سے وہی طاقتیں فائدہ اٹھائیں گے جو امن عالم اور انسانی برادری کی دوستی اور یگانگت کو پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے صحیح پسند اور امن دوست صفوں میں ان اختلافات کے منصفانہ حل پر غور و فکر اور اس حل میں امداد دینا بھی لازمی ہے۔

اب سے کچھ دن پہلے جب سوویٹ فضاوں کا تازہ کارنامہ ہر طرف دنیا میں گونج رہا تھا تو مجھے بار بار خیال آتا رہا کہ آج کل جب ہم ستاروں کی دنیا میں پہنچ کر

اپنی ہی دنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی کینگیاں، خود غرضیاں، یہ زمین کے چند گلزوں کو بانٹنے کی کوششیں اور انسانوں کی چند ٹولیوں پر اپنا سکھے چلانے کی خواہش کیسی بعید از عقل باتیں ہیں۔ اب جبکہ ساری کائنات کے راستے ہم پر کشادہ ہو گئے ہیں۔ ساری دنیا کے خریجے انسانی بس میں آ سکتے ہیں، تو کیا انسانوں میں ذی شعور، منصف مزاج اور دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں ہے جو سب کو منوا سکے کہ یہ جنگی اڑی سے سمیٹ لو۔ یہ بھم اور راکٹ، تو پیس، بندوقیں سمندر میں غرق کر دو اور ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کی بجائے سب مل کر تباہ کائنات گو چلو۔ جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں ہے، جہاں کسی کوئی سے الجھنی کی ضرورت نہیں ہے، جہاں لا محدود فضائیں ہیں اور ان گنت دنیا نیں۔ مجھے یقین ہے کہ سب رکاؤں اور مشکلوں کے باوجود ہم لوگ اپنی انسانی برادری سے یہ بات منوا کر رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتحیاب ہو کر رہے گی۔ اور آخر کار جنگ فنر ت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بناؤ ای ٹھہرے گی، جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شعر حافظ نے کی تھی

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی  
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

# فیض.....از فیض

Cyber Library

اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سب بور لوگوں کا مرغوب شغل یہی ہے اس انگریزی لفظ کے لیے مغدرت چاہتا ہوں لیکن اب تو ہمارے باں اس کے مشتقات بوریت وغیرہ بھی استعمال میں آئے گے ہیں۔ اس لیے اب اسے اردو و ارمنی میں شامل جھنا چاہیے تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں قلی مقال بری کیتی ہے۔ بلکہ میں تو شعر میں بھی حتی الامکان واحد متكلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا، اور میں کے بجائے ہمیشہ سے ہم لکھتا آیا ہوں۔ چنانچہ جب ادبی سرافراست حضرات مجھ سے یہ پوچھنے پڑتے ہیں کہ تم شعر کیوں کہتے ہو تو بات کو نالے کے لیے جو دل میں آئے کہہ دیتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ بھی میں جیسے بھی کہتا ہوں جس لیے بھی کہتا ہوں تم شعر میں خود ڈھونڈ لو ہمیشہ اسر کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن ان میں سے ڈھیٹ قسم کے لوگ جب بھی نہیں مانتے۔ چنانچہ آج کی گفتگو کی سب ذمہ داری ان حضرات کے سر ہے مجھ پر نہیں ہے۔

شعر گولی کا واحد عذر گناہ تو مجھے نہیں معلوم۔ اس میں بچپن کی فضائے گرد و پیش میں شعر کو چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دل کی گلی سمجھی کچھ شامل ہے۔ یہ نقش فریادی کے پہلے حصے کی بات ہے جس میں 28-29ء سے 34-35ء تک کی تحریریں شامل ہیں۔ جو ہماری طالب العلمی کے دن تھے۔ یوں تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ڈنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری محرك تو وہی ایک حادث ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے۔ لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو یہ دور بھی ایک دور نہیں تھا بلکہ اس کے بھی دوالگ

الگ حصے تھے جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی مختلف تھی۔ وہ یوں ہے کہ 20 سے 30 تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجیب طرح کی پے فکری، آسودگی اور ولودگی انگلیزی کا زمانہ تھا، جس میں اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نشر و ظلم میں بیشتر شجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سائدہ از تھا شعر میں اولاً حسرت موبائل اور ان کے بعد جوش، حقیقت جانشہری اور اختر شیرانی کی روایت قائم تھی، افسانے میں یلدزم اور تقدیم میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا لفظ فریادی کی ابتدائی نظمیں خدا وہ وقت نہ لائے کہ سو گوارہ تو مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیس دے مجھ کو تھے جنوم کہیں چاندنی کے دامن میں وغیرہ وغیرہ اسی باحوال کے زیر اثر مرتب ہوئیں اور اس فضائیں ابتدائے عشق کا تحریکی شامل تھا لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے کہ صحبت یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کماؤ بازاری کے سامنے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کانچ کے بڑے بڑے بانکتیں مارخان تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکا یک بچوں کی ہنسی بجھنگی، اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیاں چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آبیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگ سوز صحبت کا کھرام مچا تھا یکا یک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سب ہی راستے بند ہو گئے ہیں اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا اس کیفیت کا اختتام جو لفظ فریادی کے پہلے حصے میں آخری نظموں کی کیفیت ہے ایک نبتاب غیر معروف ظلم پر ہوتا ہے، جسے میں نے یاس کا نام دیا تھا وہ یوں ہے

بیاس

بربطِ دول کے تاریخِ ثوث بگئے  
یہاں بوس راحتوں کے محل  
مفت بگئے قدرتی مبایس فقر و عمل  
نام بستق کے بارجاتم پھوٹ کئے  
چھن گیا کیا کیف کوثر و تنیم

زحمت گریہ و بکا بے سود  
شکوہ بخت نارسا بے سود  
ہو چکا ختمِ رحمتوں کا نزول  
بند ہے مدتوں سے بابِ قبول  
بے نیاز دعا ہے ربِ کریم  
بجھ گئی شع آرزوئے جمیل  
یادِ باقی ہے بے کسی کی دلیل  
انتظارِ فضول رہنے دے  
رازِ الفت نباہنے والے  
بارِ غم سے کراہنے والے  
کاؤش بے حصول رہنے دے

34ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے اور 35ء میں میں نے ایم اے اور کالج امریسر میں ملازمت کر لی۔ یہاں سے میری اور میرے بہت سے ہم عصر لکھنے والوں

کی ڈنی اور جذبائی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کا لجھ میں اپنے رفقاء صاحبزادہ محمود الظفر مرحوم اور ان کی بیگم رشید جہاں سے ملاقات ہوئی۔ پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی، مزدور حجر یکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دہشتان مکمل گئے ہیں۔ اس دہشتان میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا تھا کہ اپنی ذات باتی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اول تو ممکن ہی نہیں، اس لیے کہ اس میں بہر حال اگر روپیش کے بھی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سودمند نتھل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتیوں اور کدوں توں یا مسرتوں اور خخششوں کے باوجود وہ بہت ہی چھوٹی سی بہت ہی محدود اور حقیر ہے۔ اس کی وسعت اور پہنچانی کا پیمانہ قوبلائی عالم موجودات سے اس کے ڈنی اور جذبائی رشتے ہیں، خاص طور پر انسانی برادری کے مشترکہ دلکھ درد کے رشتے۔ چنانچہ غم جاناں اور غم دوران تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ اس نئے احساس کی ابتدائی فریادی کے دوسرے حصے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ اور اگر آپ خاتون ہیں تو مرے محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ  
مجھ سے پہلی سے محبت مری محبوب نہ مانگ  
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات  
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے  
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات  
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟  
تو جو مل جائے تو تقدیرِ نگنوں ہو جائے  
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا  
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیانہ ظلم

بیشیم و اطاس و کتاب میں بنوائے ہوئے  
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم  
خاک میں لختہ ہوئے خون میں نہائے ہوئے

جسم نظرے ہوئے امراض کے تنویں سے

پیپ بہتی ہوئی لکھتے ہوئے ناسروں سے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر لیا کیجیے

اب بھی دلش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجیے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سے محبت مری محبوب نہ مانگ

اس کے بعد تیرہ چودہ برس کیوں نہ جہاں کاغم اپنالیں میں گزرے اور پھر فوج،

صحافت، ٹریڈ یونین وغیرہ میں گزارنے کے بعد ہم چار برس کے لیے جیل خانے

چلے گئے۔ نقش فریدی کے بعد کی دو کتابیں وست صبا اور زندگان نامہ اسی جیل خانے

کی یادگاریں ہیں۔ بنیادی طور سے تو یہ تحریریں انہیں ڈنی محسوسات اور معمولات

سے مسلک ہیں جن کا سلسلہ مجھ سے پہلی سی محبت سے شروع ہوا تھا لیکن جیل خانہ

ماشیقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے، جس میں فکر و نظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود

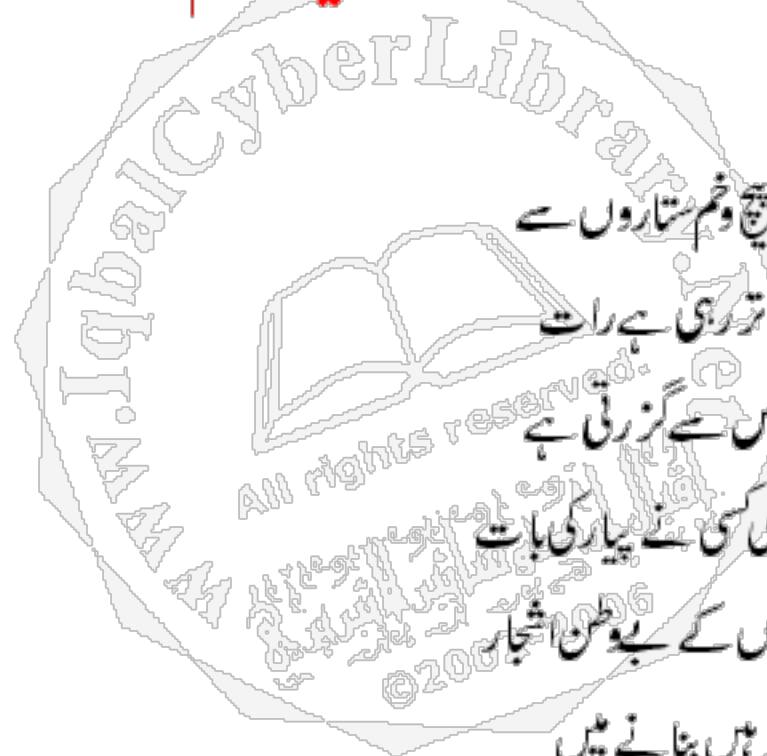
بنو دکھل جاتا ہے۔ چنانچہ اول تو یہ ہے کہ ابتدائے شباب کی طرح تمام حیات

یعنی **Sensations** پھر تیز ہو جاتی ہیں اور صبح کی پو، شام کے وھنڈ لکھے، آسمان

کی نیلا ہٹ، ہوا کے گداز کے بارے میں وہی پہلا ساتھ تحریر لوٹ آتا ہے۔ دوسرے

یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا وقت اور فاصلے دونوں باطل ہو جاتے ہیں، نزدیک کی چیزیں بھی، بہت دور ہو جاتی ہیں اور دور کی نزدیک اور فرد اور کی اتفاق کچھ اس طور سے مٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ فراقت ہجراء میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عروں سخن کے ظاہری بنا و مسلکہ اپرتوژہ دینے کی زیادہ مہلت ملتی ہے۔ جیل خانے کے بھی دو دور تھے۔ ایک حیر آباد جیل کا جواں تجربے کے اکشاف کا تحریر کا زمانہ تھا، ایک ملکمری جیل کا جواں تجربے سے آتا ہے اور تھلن کا زمانہ تھا ان دو کیفیتوں کی نمائندہ یہ دو نظمیں ہیں، پہلی صفت صبا میں ہے اور دوسری زندگی زندگی نامہ میں ہے۔

# زندگی کی ایک شام



شام کے پیچ و ختم ستاروں سے

زینہ زینہ اتر رہی ہے رات

یوں صباپاں سے گزرتی ہے

جیسے کہہ دی کسی نے پیاری بات

صحن زندگی کے بعد من اشجان

© 2006

سرگلگوں، محوجیں بنانے میں

دامن آسمان پر نقش و نگار

شانہ بام پر دملتا ہے

مہرباں چاندنی کا دست جمیل

خاک میں گھل گئی ہے آب نجوم

نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل

بزرگوشنوں میں نیلگوں سائے

لہلہتے ہیں جس طرح دل میں

موح در فراق یار آئے

دل سے پیام خیال کہتا ہے

اتنی شیریں ہے زندگی اس پل

ظلم کا زہر کھونے والے

کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

جلوہ گاہ وصال کی شمعیں

وہ بجا بھی چکے اگر تو کیا

چاند کو مغل کریں تو تم جانیں



All rights reserved.

© ۲۰۰۲-۲۰۰۶

www.gutenberg.org

# اے روشنیوں کے شہر

بزرہ سوکھ رہی ہے پھیلی زندگی دوپہر  
دیواروں کو چاث رہا ہے تھائی کا زہر  
دورانی میک ہفتی، بیہتی، اٹھتی، اگرتی رہتی ہے  
کہم کی صورت پر واقع دردوں کی گدالی اہر  
بنتا ہے اس کہم کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر

اے روشنیوں کے شہر

کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ  
ہر جانب بے نور کھڑی ہے بھر کی شہر پناہ  
تحک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ

آج مرا دل فکر میں ہے

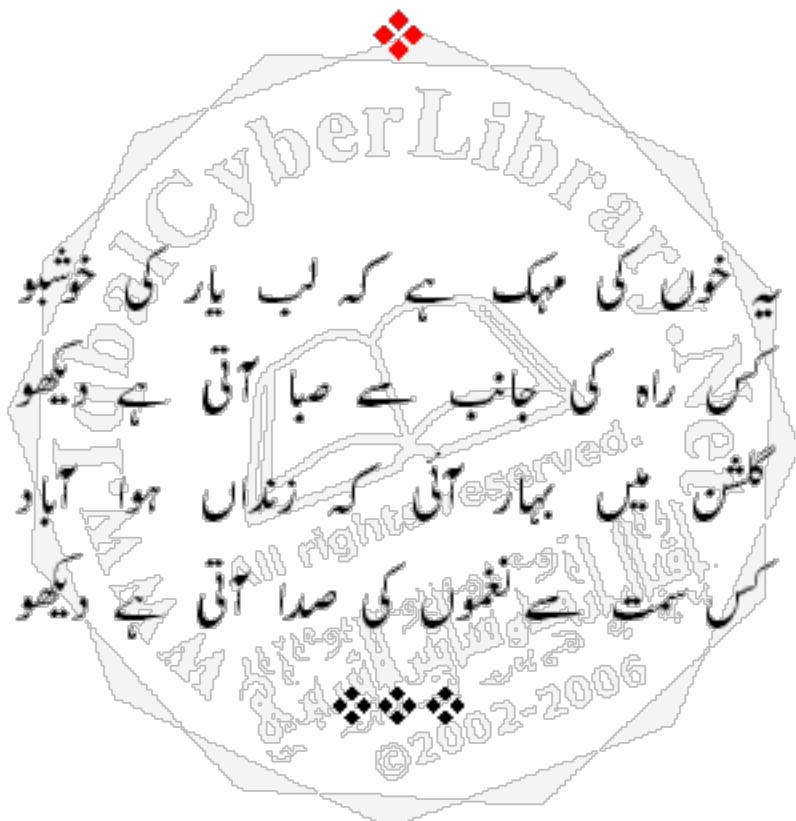
اے روشنیوں کے شہر

شبحوں سے منہ پھیر نہ جائے ارماؤں کی رو  
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو  
آج کی شب جب دیئے جلائیں اوپنجی رکھیں لو

زندگانے کے بعد کازمانہ کچھ ڈنی افراتفری کازمانہ ہے جس میں اپنا اخباری  
پیشہ چھٹا، ایک بار جیل خانے گئے۔ مارشل لاء کا دور آیا اور ڈنی اور گرد و پیش کی فضا  
میں پھر سے کچھ انسدا دراہ اور کچھ ڈنی را ہوں کی طلب کا احساس پیدا ہوا اس سکوت

اور انتظار کی آئینہ دار ایک نظم ہے شام اور ایک نامکمل غزل کے چند اشعار  
کب نہرے گا درد اے دل کب رات ببر ہو گی!





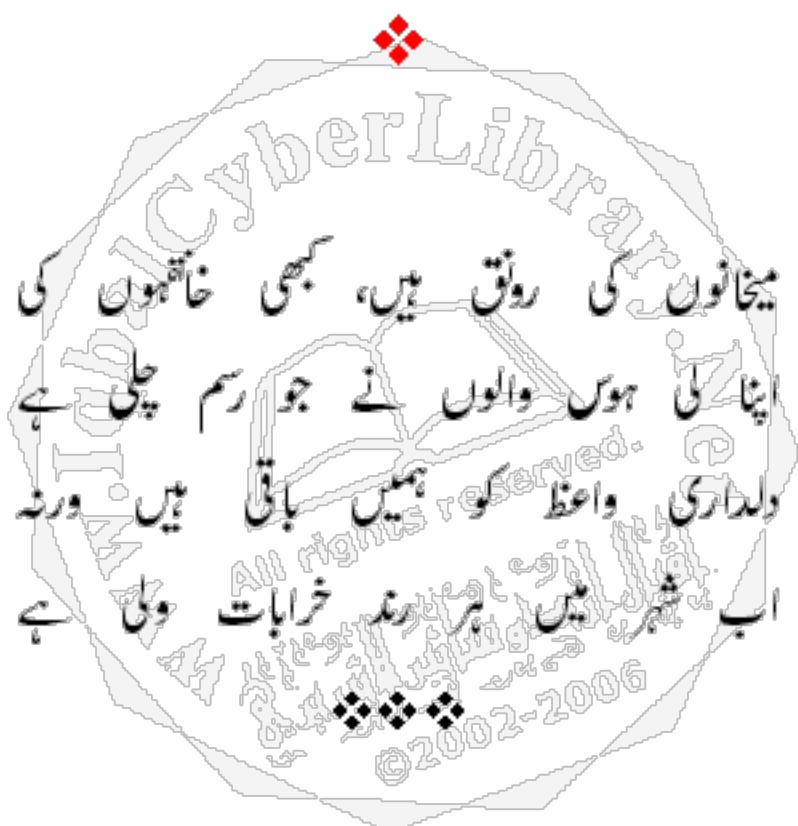
## دستِ سُنگ آمدہ

بیزار فضاء در پے آزار صبا ہے  
یوں ہے کہ ہر اک ہدم دینیت خفا ہے  
ہاں بادہ شو آیا ہے اب برگ پر موسم  
اب بیرم کے قابل روشن آپ و ہوا ہے  
المدی ہے ہر اک سمٹ سے الزام کی برمات  
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے

وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی  
ہر کاسہ مے زہر ہلائل سے سوا ہے  
ہاں جام اٹھاؤ کہ بیاد لب شیریں  
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے  
اس جذبہ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے  
مقصود رہ شوق وفا ہے نہ جنا ہے  
احساس غم دل جو غم دل کا صلا ہے  
اس حسن کا احساس ہے جو تیری عطا ہے  
ہر صح گلتاں ہے ترا روئے بھاریں  
ہر پھول تری یاد کا نقش کف پا ہے  
ہر بھیگی ہوئی رات تری زلف کی شبنم  
ڈھلتا ہوا سورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک  
ہر حرف تمنا ترے قدموں کی صدا ہے

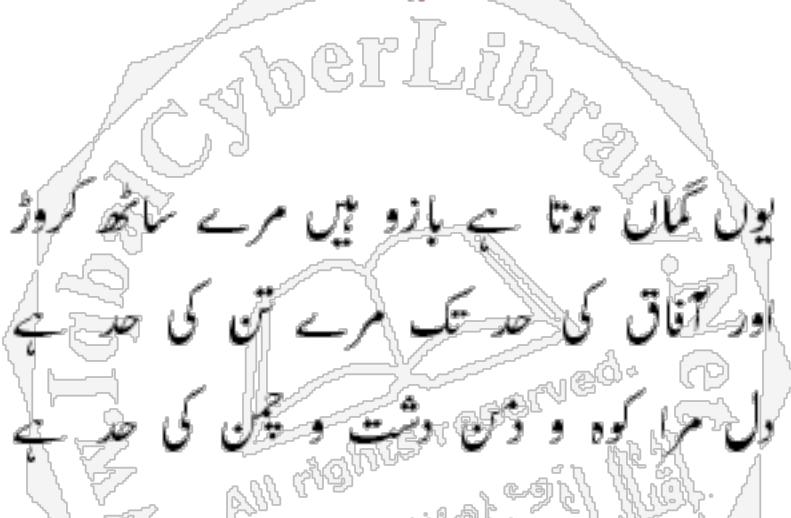
تعزیر سیاست ہے، نہ فیروں کی خطا ہے  
ظلم جو ہم نے دل وحشی پہ کیا ہے  
زمدان رہ بیار میں پابند ہوئے ہم  
زنجیر بکاف ہے، نہ کوئی بند بپا ہے  
مجوری و دعویٰ گرفتاری الفت  
بسوستہ سلک آدہ پیان وفا ہے







پریکنگ



میرے کیسے میں ہے دلوں کا سیہ فام جلال  
میرے ہاتھوں میں ہے صحنوں کی عنان گللوں  
میری آغوش میں پتی ہے خدائی ساری  
میرے مقدور میں ہے معجزہ کن نیکوں



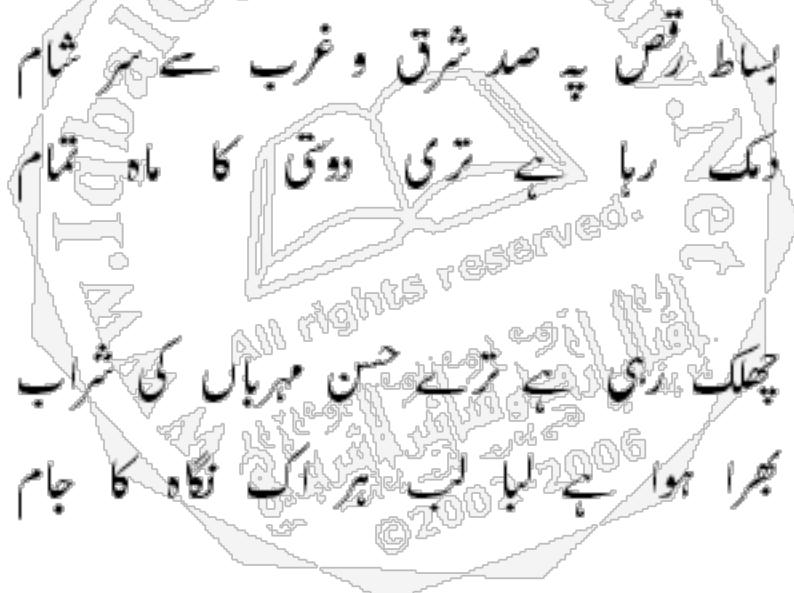


سکیا نگ

Cyber Library  
اب کوئی طبل بیجے گا، نہ کوئی شہا سوار  
سجدم موت کی واوی کو روانہ ہو گا  
اب کوئی جنگ نہ ہو گی نہ کبھی رات گے  
خون کی آنکھ کوں اشکوں سے بچانا ہو گا

کوئی دل دھڑکے گا شب بھرنہ کسی آنکن میں  
وہم منہوس پرندے کی طرح آئے گا  
سمم، خونخوار درندے کی طرح آئے گا  
اب کوئی جنگ نہ ہو گی میں و ساغر لاو  
خون لٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہو گا  
ساقیا! رقص کوئی رقص صبا کی صورت  
مطربا! کوئی غزل رنگ حنا کی صورت





گلے میں ٹگ ترے حرف لطف کی بائیں  
پس خیال کہیں ساعت سفر کا پیام

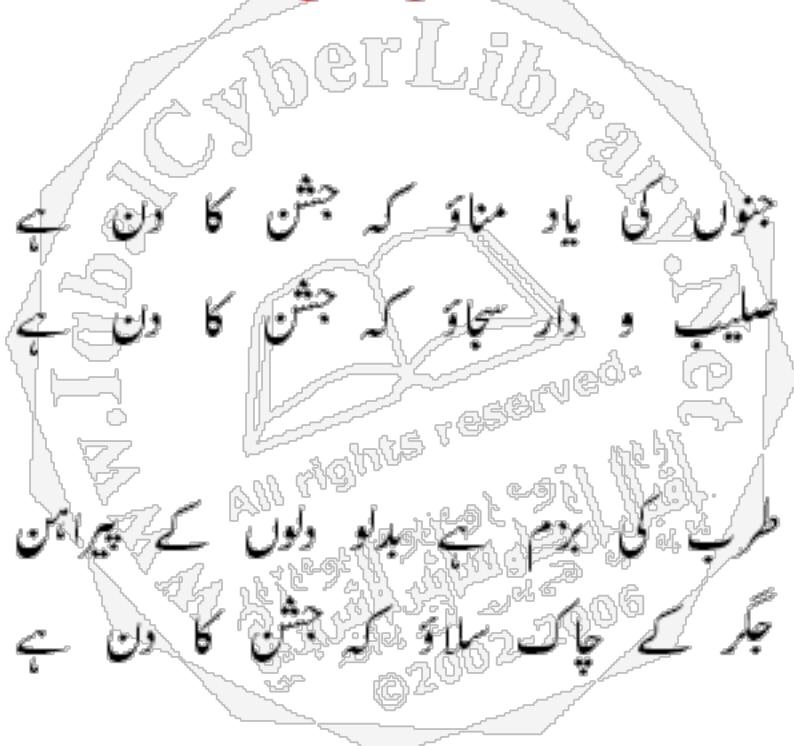
ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبت شب  
ہر ایک روئے حسین ہو چلا ہے بیش حسین

ملے کچھ ایسے، جدا یوں ہوئے کہ فیض اب کے  
جو دل پ نقش بنے گا وہ گل ہے، داغ نہیں  
ہاگن چاؤ (چین)

جولائی 1954ء



## جشن کا دن



تلگ مزاج ہے ساتی نہ رنگ مے دیکھو  
بھرے جو شیشہ، چڑھاؤ کہ جشن کا دن ہے

تمیز رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن  
ہر اگ سے ہاتھ ملاو کہ جشن کا دن ہے

ہے انتظار ملامت میں ناچوں کا ہجوم  
نظر سنپھال کے جاؤ کہ جشن کا دن ہے

وہ شورش غم دل جس کی لے نہیں کوئی  
غزل کی دہن میں سناو کہ جشن کا دن ہے

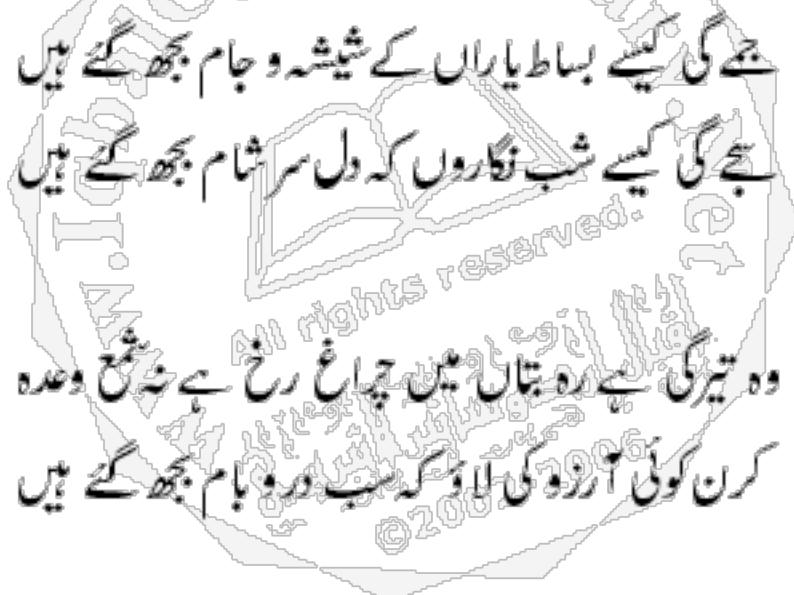






اس طرح ہے کہ ہر اک پڑ کوئی مندر ہے  
 کوئی اجڑا ہوا بے نور پرانا مندر  
 ڈھوندتا ہے جو خوابی کے بہانے کب سے  
 چاک ہر بام، ہر لک در کام آخر ہے  
 آسمان کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے  
 جسم پر راکھ ملے، ماتھے پر سیندور ملے  
 سرگلوں بیٹھا ہے چپ چاپ نہ جانے کب سے  
 اس طرح ہے کہ پس پردہ کوئی ساحر ہے  
 جس نے آفاق پر پھیلایا ہے یوں سحر کا دام  
 دامن وقت سے پیوست ہے یوں دامن شام  
 اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہو گا  
 اب کبھی رات ڈھلنے گی نہ سوریا ہو گا

آسمان اس لیے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے  
 چپ کی زنجیر کئے، وقت کا دامن چھوٹے  
 دے کوئی سکھ دہائی، کوئی پاپیل بولے  
 کوئی بت جائے، کوئی سانویں گھونگھٹ کھولے



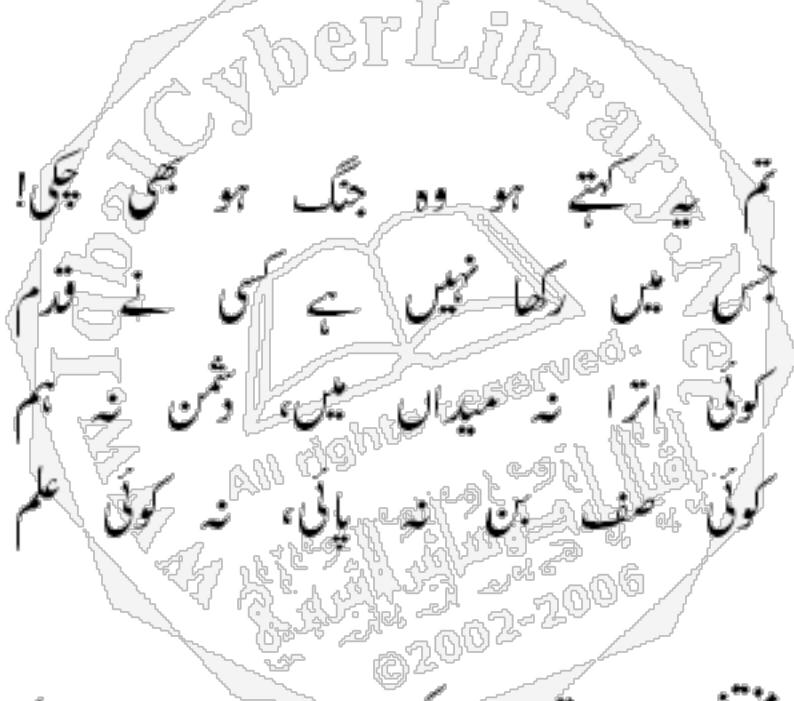
بہت سنجالا وفا کا پیاں مگر وہ بر سی ہے اب کے بر کھا  
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے تمام پیغام بھھے گئے ہیں

قریب آئے مہ شب غم، نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم  
کہ دل پہ کس کا نقش باقی ہے، کون سے نام بھھے گئے ہیں

بہار اب آکے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشن رنگ و نغمہ  
وہ گل سر شاخ جل گئے ہیں، وہ دل تھا دام بھھے گئے ہیں



تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارا نہیں!



منتشر دوستوں کو صدا دے سکا  
جنپی دشمنوں کا پتا دے سکا  
تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی!  
جس میں رکھا نہیں ہم نے اب تک قدم  
تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارا نہیں  
جسم خشے ہے، ہاتھوں میں یارا نہیں

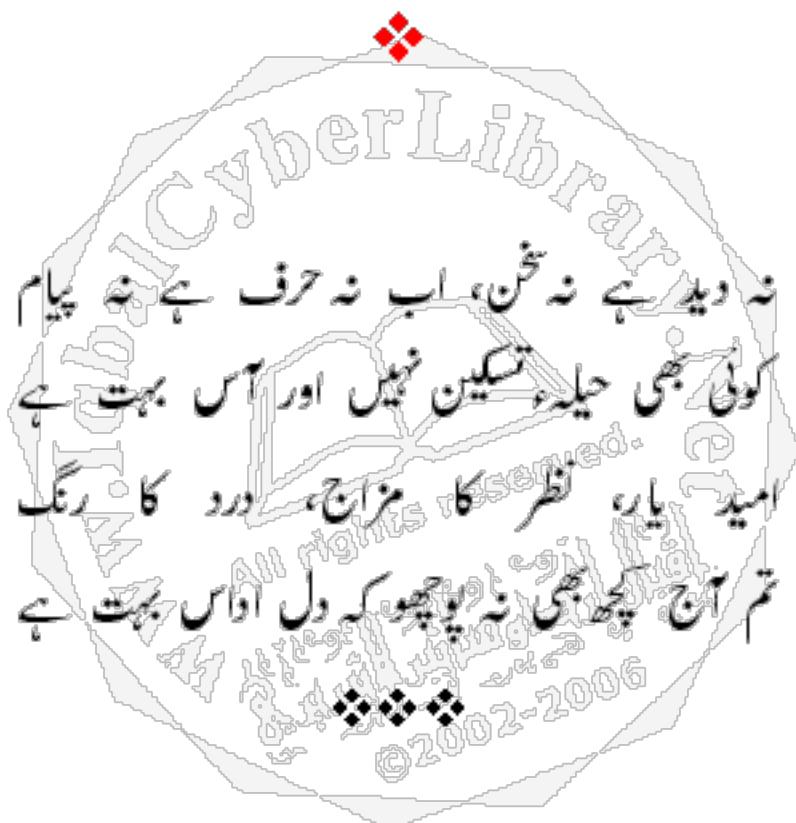
اپنے بس کا نہیں بار سنگ ستم  
بار سنگ ستم، بار کھسار غم  
جس کو چھو کر سمجھی اک طرف ہو گئے  
بات کی بات میں ذی شرف ہو گئے

دوستو، کوئے جاناں کی نامہرباں

خاک پر اپنے روشن لہو کی بھار  
اب نہ آئے گی کیا؟ اب کھلے گا نہ کیا  
اس کف نازیں پر کوئی لالہ زار؟  
اس حزین خامشی میں نہ لوئے گا کیا  
شور آواز حق نعہ کیر و دار  
شوک جسم و جاں کا ذیاں جو ہوا سو ہوا  
سود سے پیشتر ہے وذیاں اور بھی  
دوستو، ماتم جسم و جاں اور بھی  
اور بھی تلخ تر امتحان اور بھی

جنوری 1958ء







مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے  
منصف ہو تو اب حشر الٹا کیوں نہیں دیتے

ہاں نکلتہ ورد لاو لب و دل کی گواہی  
ہاں نغمہ گروساز صدا کیوں نہیں دیتے

پیان جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک  
دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

بربادی دل جبر نہیں فیض کسی کا  
وہ دشمن جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے  
**لاہور جیل**

•1958/31



# شورق زنجیر بسم اللہ

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ  
ہر اک جانبِ مچاکہرام وور و گیر بسم اللہ  
گلی کوچوں میں بھری شوش زنجیر بسم اللہ

در زندان پی بلوائے گئے پھر سے جنوں والے  
دربیڈہ دامنوں والے، پریشان گیسوں والے  
جهال میں درودل کی پھر ہوئی تو قیر بسم اللہ  
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

گنوسب داغِ دل کے، حسرتیں شوقیں نگاہوں کی  
سر دربار پر پش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی  
کرو یارو شمار ناکہ شب گیر بسم اللہ

ستم کی داستان، کشته دلوں کا ماجرا کہئے  
جو زیرِ لب نہ کہتے تھیوہ سب کچھ بر ملا کہئے  
مصر ہے محتسب راز شہیدان وفا کہئے  
گلی ہے حرف ناگفتہ پر اب تعزیر بسم اللہ  
سر مقلل چلو بے زحمت تقاضیر بسم اللہ  
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

لاہور جیل

جنوری 1959ء



# آج بازار میں پا بجوالاں چلو

چشم  
تمہت  
آج بازار میں پا بجوالاں چلو

وست اقتدار چلو، مست و رقصان چلو

حکم ۱۹۵۶ء سرمه چلو، خون بدامان چلو

راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو

حاکم شہر بھی، مجمع عام بھی

تیر الزام بھی، سنگ دشnam بھی

صح ناشاد بھی، روز ناکام بھی

ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے

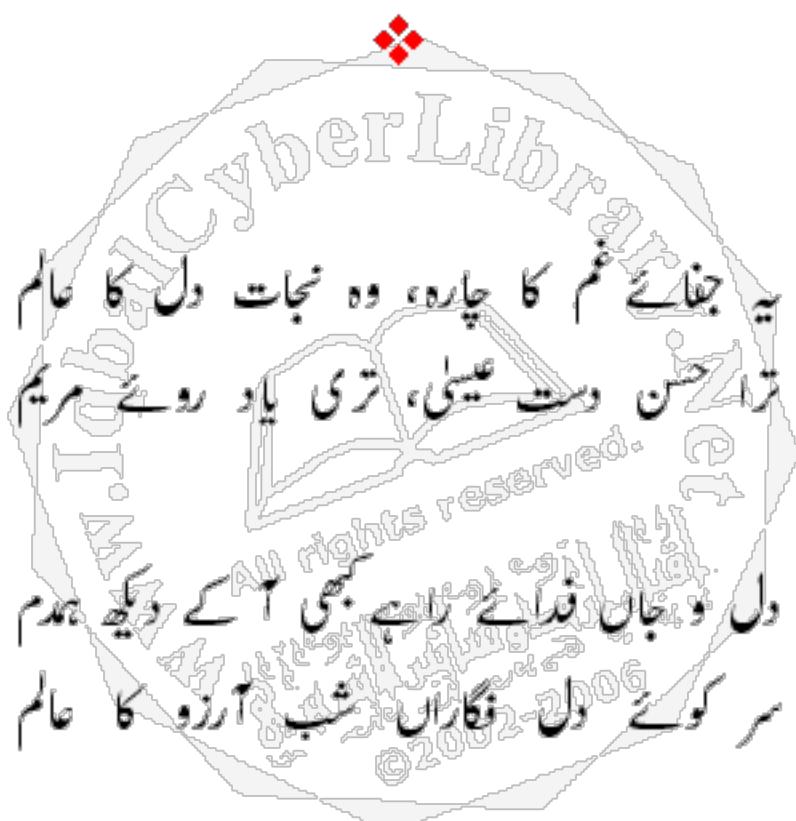
شہر جاناں میں اب با صفا کون ہے

دست قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رخت دل بامدھ لو دل فگارو چلو  
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو  
لاہور جیل

۱۱ فروری ۱۹۵۹ء





تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بھاراں  
وہ چمن جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

یہ عجب قیامتیں ہیں تری ریگور میں گزرائ  
نہ ہوا کہ مر میں ہم، نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم

لوسنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے  
وہی گوشہ قفس ہے، وہی نصل گل کا ماتم

لاہور جیل

فروری 59ء



دُور آفاق پر لہرائی کوئی نور کی اہم  
 خواب ہی خواب میں بیدار ہوا درد کا شہر  
 خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی  
 عدم باہر جدائی میں سحر ہونے لگی  
 کاسے دل میں سمجھی اپنی صبحی میں نے  
 گھول کر تلخی دیروز میں امروز کا زہر  
 دُور آفاق پر لہرائی کوئی نور کی لہر  
 آنکھ سے دُور کسی صح کی تمہید لیے  
 کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت  
 بے خبر گزری، پریشانی امید لیے  
 گھول کر تلخی دیروز میں امروز کا زہر  
 حسرت روز ملاقات رقم کی میں نے  
 دلیں پر دلیں کے یاران قدح خوار کینام  
 حسن آفاق، جمال لب و رخسار کے نام

**زندان قلعہ لاہور**

مارچ 1959ء





جو تے حسن کے نقیر ہوئے  
ان کو تشویش روزگار کہاں؟  
درد پھیں گے گیت گائیں گے  
اس سے خوش وقت کاروبار کہاں؟

جام چھلکا تو جم گئی محفل  
منت لطف غم گسار کے؟  
اشک پپکا تو کھل گیا گلشن  
رنج کم نظری بہار کے؟

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مراد  
دیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے  
ہم کہاں قسم آزمائے جائیں  
ہر چشم میں ہے اپنی بارگاہ میں ہے  
کون آیا غنی ہے جس سے کوئی  
نقہ بخشن و قمر کی بات کرے  
جس کو شوق نہیں ہو جائیں سے  
جائے تنجیر کائنات کرے

جن 59ء



ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں ثار چلے گئے  
 تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سر رکوار چلے گئے  
 تری نج اداں سے بار کے شب انتظار چلی گئی  
 مرے ضبط حال سے روٹھ کر مرے غم گمار چلے گئے

نہ سوال وصل، نہ عرض غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں  
 ترے عہد میں دل زار کے سمجھی اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سر رہ سیاہی لکھی گئی  
 یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سر زام یار چلے گئے

نہ رہا جنون رخ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا  
 جنہیں جرم عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

جو لالی 1959ء





ڈھلتی ہے موج مے کی طرح رات ان دنوں  
کھلتی ہے صبح گل کی طرح رنگ و بو سے پر  
ویراں ہیں جام پاس کرو کچھ بہار کا  
دل آرزو سے پر کرو، آنکھیں لہو سے پر



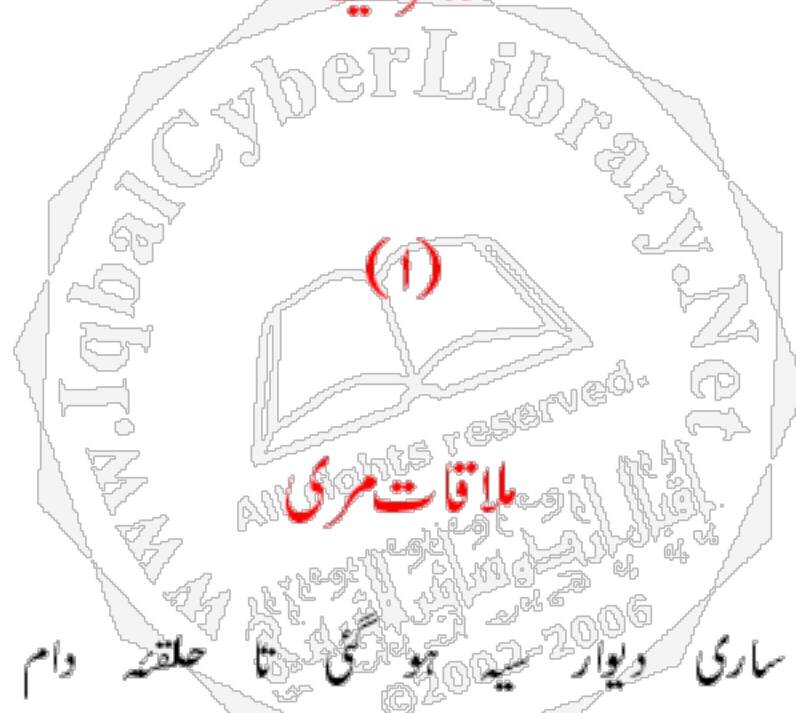
کب بھرے گا درد اے دل، کب رات بھر ہو گی  
 سخت تھے وہ آئیں گے، سخت تھے سحر ہو گی  
 کب بجان بھر ہو گی، کب اٹک بھر ہو گا  
 کس دن تری شنوائی اتے دیدہ تر ہو گی

کب مہکے گی نصل گل، کب بہکے گا میخانہ  
 کب صح خن ہو گی، کب شام نظر ہو گی

واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے  
 اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہو گی

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامت جانا نہ  
 کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہو گی





ساري ديوار سڀاں ہوئي  
ملقات مری  
راستے بجھ گئے رخصت ہوئے رہ گیر تمام  
اپنی تہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری  
ہونہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری  
اک ہتھیلی پہ جنا، ایک ہتھیلی پہ ابھو  
اک نظر زہر لیے ایک نظر میں دارو  
دیر سے منزل دل میں کوئی آیا نہ گیا  
فرقت درد میں بے آب ہوا تنخٹے داغ  
کس سے کہتے کہ بھرے رنگ سے زخموں کے ایا غ  
اور پھر خود ہی چلی آئی ملاقات مری  
آشنا موت جو دشمن بھی ہے غم خوار بھی ہے  
وہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دلدار بھی ہے

# ختم ہوئی بارش سنگ

تا جماں آج مرے تاریخ نظر سے کھا کر  
 کھلڑے کھلے ہوئے آفاق پر خورشید و قمر  
 اب کسی سمعت ماندھیرا نہ اجا لے ہو گا  
 بجھ گئی دل کی طرح راه مفہا میرے بعد  
 دوستو! قائلہ درد کا اب کیا ہو گا  
 اب کوئی اور کرے پورش گاشن غم  
 دوستو ختم ہوئی دیدہ تر کی شبنم  
 ختم گیا شور جنوں ختم ہوئی بارش سنگ  
 خاک رہ آج لیے ہے لب ولدار کا رنگ  
 کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم  
 دیکھنے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد  
 کون ہوتا ہے حریف ہے مردا فگن عشق  
 ہے مکر لب ساتی پر صلا میرے بعد

نومبر 1920ء





آج یوں موچ ور مون غم تھم گیا اس طرح غم زدوان کو قرار آ گیا  
جیسے خوشبو نے زلف بہار آ گئی جیسے پیغام دیدار یاد آ گیا

جس کی دیدار طلب و تم بھائیتھے ہم رو برو پھر سر ریگزار آ گیا  
صحیح فردا کو پھر ول تھنسے لکھ، عمر رفتہ تدا اعتبار آ گیا

رت بد لئے گلی رنگ دل دیکھنا، رنگ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں  
زخم چھلکا کوئی یا کوئی گل کھلا اشک اٹھے کہ ابر بہار آ گیا

خون عشاوق سے جام بھرنے لگے، دل سلگئے لگے، داغ جلنے لگے  
محفل درد پھر رنگ پر آ گئی، پھر شب آرزو پر نکھار آ گیا

سر فروشی کے انداز بد لے گئے، دعوت قتل پر مقتل شہر میں  
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا، لا دکر کوئی کامن ہے پر دار آ گیا

فیض کیا جانے یا رکس اس پر منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر  
میکشوں پر ہوا مختسب مہرباں، دل فگاروں پر قاتل کو پیار آ گیا



# کہاں جاؤ گے

اور پچھلے دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چند  
عکس سخو جائیں گے اینے تریس جائیں کے  
عرش کے دیدہ نمناگ سے باری باری  
سب بتا رکھ رخشاک رس جائیں کے  
اس کے مارے تھے بارے شبستانوں میں  
اپنی تہائی سمیتے گا، بچائے گا کوئی  
بے وفائی کی گھڑی، ترک مدارات کا وقت  
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی!  
ترک دنیا کا سماں، ختم ملاقات کا وقت  
اس گھڑی اے دل آواہ کہاں جاؤ گے  
اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں، دہنے دو  
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں رہنے دو  
اور ملے گا بھی تو اس طرح کہ پچھتاو گے  
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر پھر جاؤ کہ پھر نظر صح  
زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے  
اور ہر گل کشتنے واماندگی آخر شب  
بھول پکر ساعت ورماندگی آخر شب

پہچان ملاقات پـ اصرار کرے

1961 دسمبر

All rights reserved

© 2002-2006

یک بیک شورش فغاں کی طرح  
 نصل گل آئی امتحان کی طرح  
 صحن مکشناں میں بھر مشتا قاں  
 پھر اب سے ہر لکھ کھج عجی کماں کی طرح  
 پہ ہوا جام ارغوان کی طرح  
 یاد آیا جنون گم گشتہ  
 بے طلب قرض دوستاں کی طرح  
 جانے کس پر ہو مہرباں قاتل  
 بے سبب مرگ ناگہاں کی طرح  
 ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں  
 دل سنجالے رہو زباں کی طرح  
 مئی 1926ء



آسمان کی گلوکار میں دم توڑتا ہے طفل ابر  
 جم رہا ہے ابر کے ہونگوں پر خون آلود کف  
 بجھتے بجھتے بجھ گئی ہے عرش کے حجروں میں آگ  
 دھیڑے دھیڑے بچھرا ہی ہے ما تمی نثاروں کی حف  
 اے صبا شایدِ ترے ہمراہ یہ خوفناک شام  
 سر جھکائے جا رہی ہے شہریاراں کی طرف  
 شہریاراں جس میں اس دم ڈھونڈتی پھرتی ہے موت  
 شیر دل بانگوں میں اپنے تیر و نشتر کے ہدف  
 اک طرف بجتی ہے جوش زیست کی شہنا بیاں  
 اک طرف چلگھاڑتے ہیں اہرمن کے طبل و دف  
 جا کے کہنا اے صبا، بعد از سلام دوستی  
 آج شب جس دم گزر ہو شہریاراں کی طرف  
 دشت شب میں اس گھڑی چپ چاپ ہے شایدِ رواں  
 ساتی صح طرب، نغہ بلب، ساغر بکف  
 وہ پینچ جائے تو ہو گی پھر سے برپا انجمن  
 اور ترتیب مقام و منصب و جاہ و شرف



نہ لنو تو ناٹ کیم کش دل رینہ رینہ لنو دیا  
 جو بچے ہیں تک سمیت لوتن داغ داغ لٹا دیا  
 میرے بچا میر کو تو پیدا ہو صرف دشمناں کو خبر کرو  
 جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پر کفن میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو  
 کہ غرور عشق کا بالکلپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا

ادھر ایک حرف کہ کشتی یہاں لاکھ عذر تھا گفتني  
 جو کہا تو سن کے اڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے  
 رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا



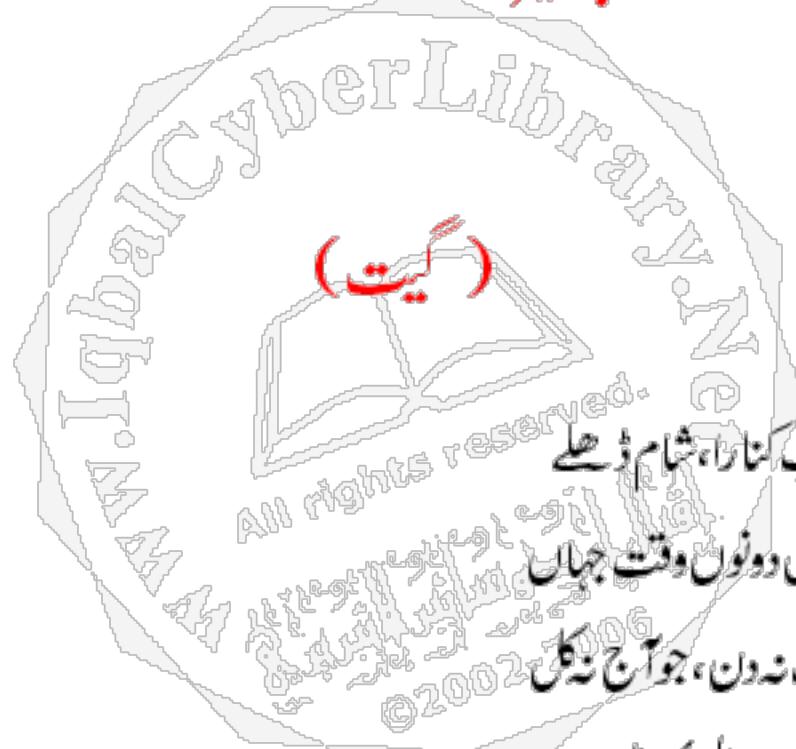
# خواضانت غم

دیار یاد تری جوش جنوں پہ سلام  
 مرے وطن ترے دامان تاب تار کی خیر  
 رو یقین تری انشان خاک و خون پہ سلام  
 مرے چمن ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر  
 ہر ایک خانہ دیوالی کی تیر کل بچ سلام  
 ہر ایک خاک بسر، خانماں خراب کی خیر  
 ہر ایک کشته نہ حق کی خامشی پہ سلام  
 ہر ایک دیدہ پر نم کی آب و تاب کی خیر  
 رواں رہے یہ روایت، خواضانت غم  
 نشاط ختم غم کائنات سے پہلے  
 ہر اگ کے ساتھ رہے دولت امانت غم  
 کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے  
 سکون ملے نہ کبھی تیرے پا فگاروں کو  
 جمال خون سر خار کو نظر نہ لگے  
 اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں شاروں کو  
 جلال فرق سردار کو نظر نہ لگے

لندن 1962ء



# جب تیری سمندر آنکھوں میں



یہ دھوپ کنارا، شام ڈھٹے  
All rights reserved.

ملتے ہیں دونوں وقت جہاں

جورات نہ دن، جوانج نہ کل  
© 2002

پل بھر کوا مر، پل بھر میں دھواں

اس دھوپ کنارے، پل دو پل

ہونٹوں کی لپک

باہوں کی چھنک

یہ میل ہمارا، جھوٹ نہ رج

کیوں زار کرو، کیوں دوش دھرو

کس کارن جھولی بات کرو

جب تیری سمندر آنکھوں میں

اس شام کا سورج ڈوبے گا

سلکھ سوئیں گے گھر دروازے

اور راہی اپنی رہ لے گا

(لندن سے)

۱۹۶۳ء

# رنگ ہے دل کامرے

Cyber Library

تم نا ہے تھا تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے  
آسمان حد نظر، راہبُور، راہگور شیشہ میں شیشہ می  
اور ب شیشہ می، راہبُور، رنگ فلک  
رنگ ہے دل کامرے خون جسرا ہونے تک  
چمپیں رنگ کبھی راحت نہیں اور کارنگ  
سرمئی رنگ کہ ہے ساعت بیز ار کارنگ

زرو پتوں کا، خس و خار کارنگ

سرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کارنگ

زہر کارنگ، ابھورنگ، شب تار کارنگ

آسمان، راہگور، شیشہ می

کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دھقی ہوئی رگ

کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے

اب جو آئے ہو تو پھر و کہ کوئی رنگ، کوئی رت، کوئی شے ایک جگہ پڑھرے،

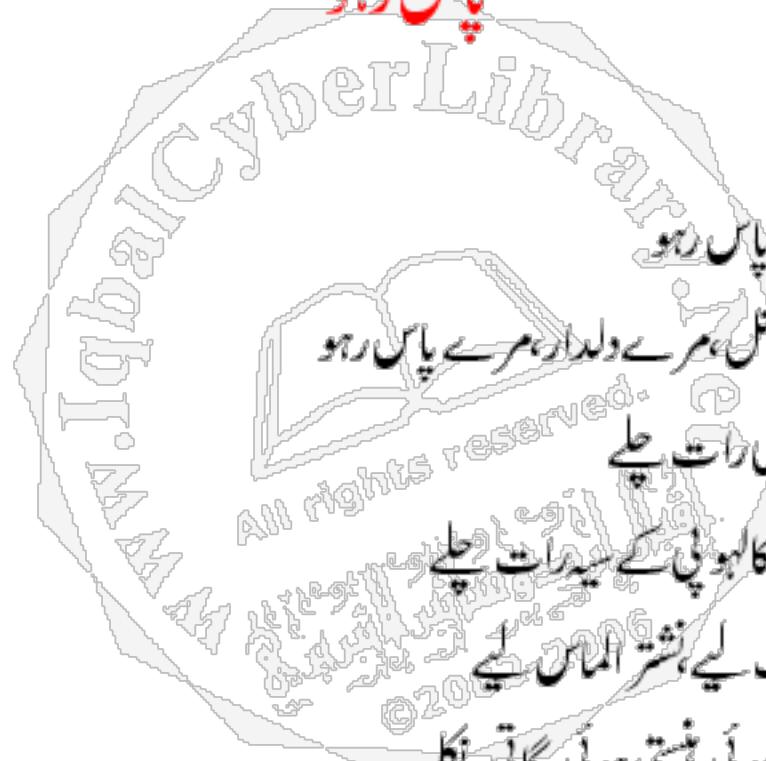
پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے

آسمان حد نظر، راہگور راہبُور، شیشہ می شیشہ می

(مسکو)

اگست 1963ء

پاک رہو



تم مرے پاک رہو  
میرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاک رہو  
جس گھری رات چلے  
آسمانوں کا بہوپی کے یہ رات چلے  
مرہم مشک لیے، نشر الماس لیے  
بین کرتی ہوئی، نہتی ہوئی، گاتی نکلے

درد کے کاسنی پازیب بجائی نکلے

جس گھری سینوں میں ڈوبے ہوئے دل  
استینوں میں نہاں ہاتھوں کے رہ تکنے لگیں

اس لیے

اور بچوں کے بلکنے کی طرح تقلقل مے

بہرنا سودگی مچلے تو منائے نہ منے

جب کوئی بات ہنائے نہ بنے

جب نہ کوئی بات چلے

جس گھری رات چلے

جس گھری ماتھی، سنسان، سیہ رات چلے

پاس رہو

میرے قاتل، مرے دلدار ہے پاس رہو!

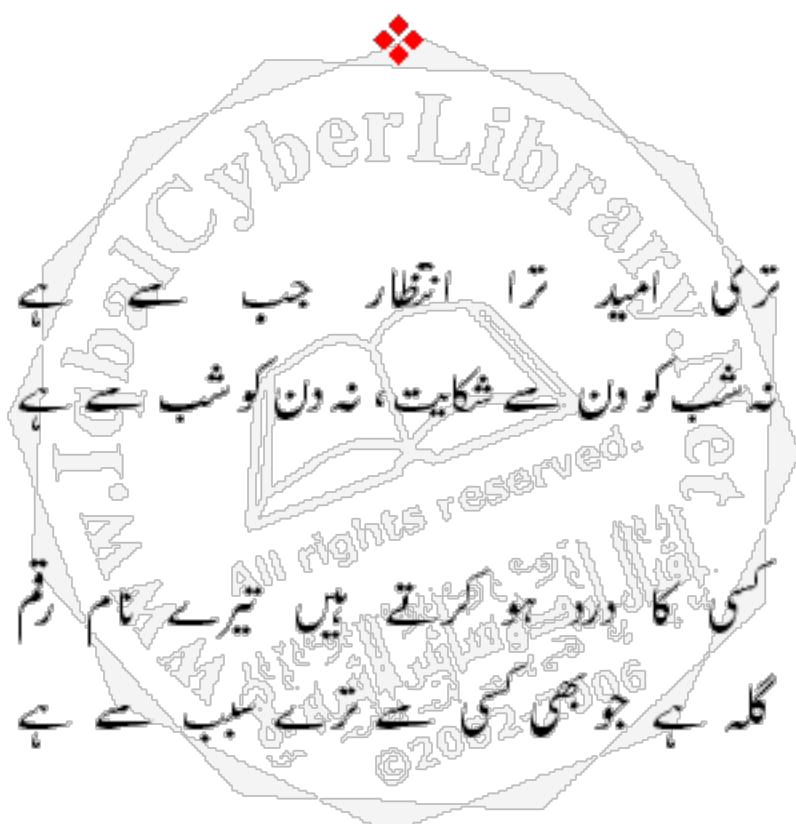
ماں کو 1963



All rights reserved.

www.Ilib.org

© 2002-2006



ہوا ہے جب سے دل ناصور ہے قابو  
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے  
طرح طرح کی طلب تیرے رنگِ لب سے ہے

کہاں گئے شب فرقت کے جانے والے  
ستارہ سحری ہم کلام کب سے ہے  
**سبتی 1957ء**





تھے بزم میں سب دودھ سر بزم سے شاداں  
بیکار جلایا ہمیں روشن نظری نے

مے خلنے میں عاجز ہوئے آزردہ دلی سے  
مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشقتہ سری نے

یہ جامسہ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا  
مهلت ہی نہ دی فیض، کبھی بنجیہ گری نے

لندن 1962ء



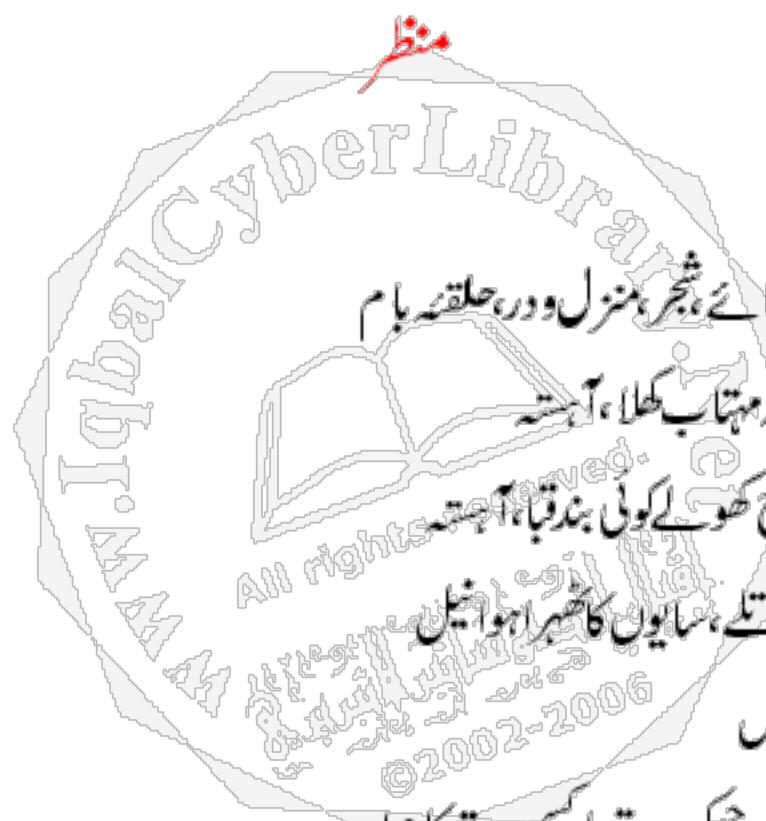


سینے پہ باتھ ہے، نہ نظر کو تلاش بام  
دل ساتھ دے تو آج غم آرزو کریں

کب تک سنے گی رات، کہاں تک سنائیں ہم  
ٹکوے گلے سب آج ترے روپرو کریں

ہدم حدیث کوئے ملامت سنائیو  
دل کو اہو کریں کہ گریبان رفو کریں





روگز، سائے شجر، منزل و در، حلقة بام  
بام پر سنیہ مہتاب کھلا، آہستہ  
جس طرح کھولے کوئی بندقا، آہستہ  
حلقة بام تلے، سایوں کا خبر اہوا نیل  
نیل کی جمیل  
جمیل میں چپکے سے تیرا، کسی پتے کا حباب

ایک پل تیرا، چلا، پھوٹ گیا، آہستہ  
بہت آہستہ، بہت ہلاکا، خنک رنگ شراب  
میرے شیشے میں ڈھلا، آہستہ  
شیشہ وجام ہراجی، ترے ہاتھوں کے گلاب  
جس طرح دور کسی خواب کا نقش  
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ

دل نے دہر لیا کوئی حرف وفا، آہستہ  
تم نے کہا آہستہ  
چاند نے جھک کے کہا  
اور ذرا آہستہ

ماں کو 1964ء

❖ ❖ ❖ انتظام ---- حصہ اول -- ❖ ❖ ❖